اقبال
کی
اردو نثر
ڈاکٹر عبادت بریلوی

مطبع : تاج آفسٹ پریس، الہ آباد
بار اول ---------- ۱۹۸۳ء
تعداد ---------- ۵۰۰
---------- ..

تقسیم کار
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

پیش لفظ

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی ہے اور انسان کو بلندی سے ہم کنار کرنے کا ایک مکمل لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ وہ عظمتِ انسانی کے قائل ہیں۔ اسی لئے وہ انسان کو آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ غلط نظامِ اقدار نے جس طرح انسانیت کو زخموں سے چور کردیا ہے وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے لیکن اپنی مثبت اور رجان دار فکر سے اس کے زخموں پر مرہم بھی رکھتے ہیں۔ وہ مشرق کے شاعر ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے مغنّی ہیں۔ انھوں نے اسلامیانِ ہند کے معاملات و مسائل کی ساری تفصیلات و جزئیات کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ بین الاقوامی سیاست، ملکی و قومی معاملات، طبقاتی تفریق کو مٹا دینے کے خیالات اور ایک نئے نظامِ اقدار کے نتیجے میں مساوات کو عام کرنے کے تصورات ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے فکرِ اسلامی کے اسرار و رموز اس لئے کھولے ہیں کہ انسانی زندگی حریت اور مساوات کے خیالات سے آشنا ہو اور اس طرح یہ حیاتِ انسانی ایک دفعہ پھر جنت ارضی کا روپ اختیار کرلے۔ انھوں نے ان خیالات و نظریات اور افکار و تصورات اور اس سلسلے کے متنوع اور مختلف موضوعات کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کے ہاں حسن و جمال کی دنیائیں آباد ہوگئی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ اسلامیانِ ہند بیسویں صدی کو عہدِ اقبال سمجھتے ہیں اور اس عہد میں وہ اقبال اور کلامِ اقبال سے زندگی کا شعور اور حسن و جمال کا ذوق حاصل کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کلامِ اقبال کو اپنے دلوں میں جگہ دی ہے، اس کو اپنے حواس پر طاری کیا ہے اور اس کی روشنی میں اپنے کاروانِ حیات آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال اور کلامِ اقبال اسلامیانِ ہند کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی معاملات و مسائل کو سلجھانے کے لئے ایک بہت بڑا سہارا رہے ہیں۔ انھوں نے ہماری قومی و ملی زندگی کی رگوں میں نیا خون دوڑایا ہے اور اس کو ذہنی و فکری اور جذباتی و جمالیاتی اعتبار سے انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ ان کی شاعری کی ساحری ہے، لیکن ان کی نثر نگاری بھی اس اہم کام کو انجام دینے میں پیچھے نہیں رہی۔ ان کی نثر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور وہ اقبال کی عظیم شخصیت کا صحیح آئینہ ہے۔ اس میں بھی وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی شاعری میں ہے۔ ان کے افکار و خیالات اور نظریات و تصورات ان کی نثر میں بھی پوری طرح واضح ہوتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان سب کی تفصیل اور جزئیات ہمیں ان کی نثر ہی میں ملتی ہیں۔ چونکہ نثر میں تحلیل و تجزیہ کی نسبتاً زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے اقبال کا مفکرانہ انداز اور تجزیاتی مزاج ان کی نثر ہی میں اپنے آپ کو پوری طرح رونما کرتا ہے۔ پھر ان کی نثر میں موضوعات کا جو تنوع ہے، فکر کی جو گہرائی ہے، خیال کی جو بلندی ہے، اظہار کی جو جمال آفرینی ہے، وہ اس کو خاصے کی چیز بنا دیتی ہے۔ اقبال کی مفکرانہ اور شاعرانہ عظمت سے صحیح طور پر آشنا ہونے کے لئے یہ نثر ایک بہت بڑا ذریعہ بلکہ سہارا ہے۔

اقبال نے نثر میں باقاعدہ کتابیں بھی لکھی ہیں، مضامین و مقالات بھی تحریر کئے ہیں اور ان کے خطوط کا بھی ایک خاصا بڑا سرمایہ موجود ہے، اور مجموعی طور پر یہ تمام تحریریں مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ابھی تک علامہ اقبال کی نثر کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ابھی تک اس حقیقت کو بھی واضح نہیں کیا گیا ہے کہ ان کی

نثر میں ایک ایسا اسلوب موجود ہے جو ان کے موضوعات کے اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ تخلیقِ حسن کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ اس اسلوب کی انفرادیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور اردو نثر کی روایت میں ـــ خصوصاً بیسویں صدی کی روایت میں ـــ اس کا ایک خاص مرتبہ ہے۔

میں نے اسی احساس کے پیشِ نظر علامہ اقبال کی نثر نگاری کے تجزیے کے کام کو اپنے ذمے لیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ علامہ اقبال کی نثر کا ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ تیار ہو جائے تاکہ پڑھنے والے اس کی اہمیت سے آشنا ہوں اور انھیں اس حقیقت کا اندازہ ہو کہ نظم اور شاعری کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی نثر بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ اور جو کارنامے ان کی شاعری نے انجام دیئے ہیں، وہی کارنامے ان کی نثر بھی انجام دیتی رہی ہے۔

آسانی کے خیال سے میں نے علامہ اقبال کی نثر کے اس تحقیقی و تنقیدی جائزے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے:

پہلا باب تمہیدی ہے اور اس میں نثر نگاری اور اسلوب نثر کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں علامہ اقبال کی نثر کے بنیادی خدوخال نمایاں ہو سکتے ہیں۔

دوسرے باب میں عہدِ اقبال یعنی بیسویں صدی میں اردو کے رجحانات کا تجزیہ ہے تاکہ وہ منظر اور پس منظر سامنے آسکے جو روایت اور تجربے کی صحیح صورتحال کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ضروری ہے۔ اقبال کی نثر بھی اسی عہد کی پیداوار ہے اور انھوں نے روایت اور تجربے کی ہم آہنگی سے اس عہد میں جس اسلوبِ نثر کی تشکیل کی ہے اسکی صحیح اندازہ دانی اسی منظر اور پس منظر کو سامنے رکھ کر کی جا سکتی ہے۔

تیسرے باب میں علامہ اقبال کی تصانیف نثر کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس جائزے کا اہتمام اس خیال سے کیا گیا ہے کہ جو کچھ علامہ اقبال نے نثر میں پیش کیا ہے، اس سے پڑھنے والوں کو آشنا ہونے کا موقع ملے۔ اس کو علامہ اقبال کی تصانیف نثر کا ایک تعارف بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ تنقید اور تجزیہ کے پہلو کو شعوری طور پر اس میں نمایاں نہیں کیا گیا۔ تنقید اور تجزیے کے پہلو چوتھے اور پانچویں باب میں زیادہ نمایاں ہیں کیونکہ ان میں اس

بات کی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اقبال کی نثر نگاری کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اس طرح ہو جائے کہ اس کے تمام نشیب و فراز نہ صرف پڑھنے والے کے سامنے آجائیں بلکہ اسکے ذہن و فکر کا حصہ بھی بن جائیں۔

چوتھے باب میں ان کے موضوعاتِ نثر کا تنقیدی جائزہ ہے۔

پانچویں باب میں ان کے اسلوبِ نثر کی تنقیدی وضاحت ہے۔

چھٹے باب میں یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ اردو نثر کی روایت میں علامہ اقبال کی نثر نگاری کی کیا اہمیت ہے اور یہ کہ اس روایت میں ان کی نثر کا مرتبہ کیا ہے۔

یہ جائزہ ایک نہایت معمولی سی تحقیقی، تنقیدی اور ادبی کوشش ہے۔ اس کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس میں اس بات کی کوشش ضرور کی گئی ہے کہ علامہ اقبال کی عظیم شخصیت جس طرح ان کی نثر میں ظاہر ہوئی ہے کسی حد تک اس کی وضاحت ہو جائے، اور ان کی عظیم شخصیت نے جس طرح اس نثر کو عظیم بنایا ہے، اس کا بھی کچھ اندازہ ہو جائے۔ اس کوشش نے اس جائزے کو علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی نثر نگاری دونوں کا ایک جائزہ بنا دیا ہے، اور اس جائزے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کی نثر نگاری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

عبادت بریلوی

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

۲۵ اپریل ۱۹۷۷ء

پہلا باب

نثر نگاری

ا

مشہور فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیر نے اپنے ایک ڈرامے میں ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جس کو یہ علم نہیں کہ نثر کس کو کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ نثر کے بارے میں مختلف لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہے۔ جب اس کو یہ جواب ملتا ہے کہ جو کچھ وہ بولتا ہے اور ہمیشہ سے بولتا رہا ہے وہی نثر ہے، تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں؛ ایک تو یہ کہ نثر کوئی ایسی چیز نہیں جس کو حیرت سے دیکھا جائے یا جس کی تخلیق کے لئے ایسے حالات درکار ہوں جو دوسری اصنافِ فن کی تخلیق کے لئے ضروری نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ نثر ایک عام چیز ہے۔ ہر شخص اس کو استعمال کرتا ہے، اس سے کام لیتا ہے اور اس کا سہارا لئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ انسان نے ابتدائے آفرینش سے اپنے مافی الضمیر کو نمایاں کرنے کے لئے، اپنی بات دوسروں تک پہونچانے اور اپنے خیالات اور جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے کے لئے نثر سے کام لیا ہے۔ اپنی معلومات اور تجربات کے اظہار و ابلاغ کے لئے بھی انسانیت کی تاریخ میں نثر سے

زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ کام انسانیت کی تاریخ میں شاعری سے بھی لئے گئے ہیں، بلکہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ نثر سے پہلے انسان نے نظم کی تخلیق کی ہے اور اسی کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار و ابلاغ کے لئے استعمال کیا ہے لیکن نظم اور شاعری بنیادی طور پہ جذبات اور تخیلات کی زبان ہے۔ نثر کا دائرہ اس کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ وہ ہر طرح کے معاملات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اس کو شاعری کی طرح بعض پابندیوں میں اسیر اور کچھ حدود میں پابہ زنجیر نہیں کیا جا سکتا۔ جو جس کا جی چاہے بولے اور لکھے، وہ سب نثر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بولنے اور لکھنے کا انداز اور آہنگ بولنے اور لکھنے والے کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ یہ شخصیت حالات اور ماحول کے زیر اثر تشکیل و تعمیر کی منزلوں سے گذرتی ہے۔ بولنے یا لکھنے کے موضوعات کا بھی اس پر اثر ہوتا ہے۔ الفاظ کے استعمال کی کیفیت اور لہجے اور انداز کی حالت بڑی حد تک موضوعات کی پابند ہوتی ہے۔ روایت کے اثرات جو اپنے پیش رووں کے انداز اور لب و لہجہ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، وہ بھی نثر کے مخصوص انداز کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

نثر لکھنے یا بولنے والا جس جگہ آنکھ کھولتا ہے، جس ماحول میں اس کی نشو و نما ہوتی ہے، جو تہذیبی اور معاشرتی اثرات اسے ورثے میں ملتے ہیں، جن حالات میں اس کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ جن لوگوں سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو ذہنی رجحانات اس کے یہاں پیدا ہوتے ہیں، جن مصنفوں کا وہ مطالعہ کرتا ہے اور جو خیالات و نظریات اس کے یہاں تشکیل پاتے ہیں، ان سب کے مجموعی اثرات سے اس کا مخصوص انداز، آہنگ اور لب و لہجہ وجود اختیار کرتا ہے اور اسی سے اس کی وہ نثر پیدا ہو جاتی ہے جس کو وہ بولنے یا لکھنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کے بولنے اور لکھنے کا انداز مختلف ہوتا ہے اور ہر شخص میں ایک مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس میں حسن ہو یا نہ ہو، اور لوگ اس کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن نثر بولنے یا لکھنے والے کی

کی اس انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۲

ادبی نثر میں اس انفرادیت کا اظہار کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ ادبی نثر تخلیق کرنے والے اس کے ذریعے اپنے ایسے تجربات پیش کرتے ہیں جن کی نوعیت تخلیقی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شاعری اور نثر میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے، حالانکہ شاعری اور نثر نگاری بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعری انسان کے ذاتی لمحوں کی پیداوار ہوتی ہے اور تخیل کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ نثر نگاری بھی جذباتی لمحوں کی پیداوار تو ہو سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ صرف اُسی حد تک اپنے آپ کو محدود کرلے۔ اس کا دائرہ شاعری کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ وہ زندگی کے کسی بھی پہلو کو اپنا موضوع بنا سکتی ہے، لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ جذبے اور تخیل کو اپنی بنیاد بنائے۔ خالص عقلی اور منطقی معاملات و مسائل کے بارے میں بھی ایسی نثر لکھی جا سکتی ہے، اور لکھی گئی ہے، جس کو ادبی نثر کہا جا سکے اور جس میں علمیت کے باوجود ادبیت موجود ہو۔ ادبی تاریخ کے ہر دور میں اس کی اچھی خاصی مثالیں ملتی ہیں۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، شاعری میں بھی خاصا تنوع نظر آتا ہے۔ تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے اس میں مختلف اصناف کی تشکیل ہوتی ہے اور اس تکنیک اور ہیئت میں خاصی رنگا رنگی اور تنوع کا احساس ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ نثر نگاری کا کینوس یا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ اس میں موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے نسبتاً زیادہ تنوع اور رنگارنگی کا احساس ہوتا ہے۔ نثر خالص بیانیہ بھی ہو سکتی ہے۔ اور ضروری نہیں کہ اس میں ادبی حسن پیدا کرنے کے لئے شاعری کی طرح

تخیل سے کام لیا جائے اور تشبیہات و استعارات سے اس کو بوجھل بنایا جائے جس تو سادگی اور روانی میں بھی ہوتا ہے چنانچہ بیانیہ نثر میں یہی دو پہلو حسن کو پیدا کرتے ہیں۔ لیکن صرف اسی حد تک لکھنے کا اپنے آپ کو محدود کرنا ضروری نہیں۔ اپنے تجربے کی نوعیت کے پیش نظر وہ اپنی اس نثر میں تخیل کی رنگ آمیزی کر کے اس کو رنگین اور پرکار بنا سکتا ہے۔ اس طرح اس کی نثر میں شاعری کا رنگ و آہنگ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اور نثر میں شاعری کرنے یا شاعرانہ انداز اختیار کرنے پر آج تک کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ انیسویں صدی کی اردو نثر میں مولانا محمد حسین آزاد اور بیسویں صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد اس کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نثر نگاری کا حسن ان کے شاعرانہ رنگ و آہنگ میں ہے لیکن جس کو ہم سادگی اور روانی کا عکس کہتے ہیں وہ بیسویں صدی کے نثر نگاروں میں سرسید، نذیر احمد، حالی اور شبلی کی نثر میں اور بیسویں صدی کے نثر نگاروں میں علامہ اقبال مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا ظفر علی خاں اور اسی قبیل کے بعض دوسرے نثر نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔

جان مڈلٹن مرے (JOHN MIDDLETON MURRY) نے اپنی کتاب THE PROBLEM OF STYLE میں شاعری اور نثر پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "ادبی نثر کے انداز اور رنگ و آہنگ کی تشکیل میں کسی زمانے کے فیشن، ذوقِ جمال اور اس کے زیر اثر تشکیل پانے والے مزاج کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے"۔ فارم اور اسلوب کی تشکیل اسی صورتِ حال کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:—

"THE LITERARY GENIUS WORKS ITSELF OUT IN THE FORM OF PROSE FICTION OR POETICAL FICTION, INDIFFERENTLY, AND THAT THE FORM WILL LARGELY DEPEND UPON THE TASTE OF THE AGE." [1]

---

[1] JOHN MIDDLETON MURRY: THE PROBLEM OF STYLE, P.52

یہ ضروری نہیں کہ کسی خاص زمانے میں نثر نگاری کا صرف ایک خاص انداز اور آہنگ پیدا ہو۔ مخصوص حالات اور لکھنے والوں کی مخصوص ذہنی کیفیات اور رجحانات کے زیرِ اثر مختلف انداز اور آہنگ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مخصوص تہذیبی اور معاشرتی حالات اور مجموعی طور پر زبان کی ارتقائی کیفیات بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرامن اور رجب علی بیگ سرور، حالی اور شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد، اقبال اور ابوالکلام آزاد، عبدالحق اور فرحت اللہ بیگ، ہم عصر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جداگانہ انداز کی نثر لکھ سکتے ہیں۔ اس اختلاف کے باوجود یہ سب اپنی اپنی جگہ ادبی نثر کی تخلیق میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک طرح کی باقاعدگی اور استواری اور غور و فکر کی فضا نثر نگاری کا تقاضا کرتی ہے اور اس کے ہاتھوں نثر میں ایک صحیح اور جاندار ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ایسی نثر مؤثر ہوتی ہے اور پڑھنے والے کے دل اور دماغ دونوں اس سے مثبت اثرات قبول کرتے ہیں۔ اچھی نثر کا کام افراد کو ذہنی اعتبار سے متاثر کرنا ہے۔ وہ شاعری کی طرح صرف جذبات ہی پر اثر انداز نہیں ہوتی، ذہن کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ انسان کی پوری شخصیت پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ شاعری بھی یہ کام کرتی ہے لیکن نثر کے مقابلے میں اس کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔ وہ جذبات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور جذبات پر اس کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ نثر جذبات کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور کرتی بھی ہے لیکن ذہن و فکر کو متاثر کرنا اس کا خاص میدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نثر کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔ مڈلٹن مرے نے صحیح لکھا ہے کہ "نثر ایک ایسا آلہ ہے جس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور اس میں مختلف پہلوؤں کو متاثر کرنے کی جو صلاحیتیں ہیں، ان کو ابھی تک صحیح طور پر دریافت نہیں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے نثر کے مقابلے میں شاعری کی صلاحیتیں نسبتاً زیادہ دریافت کی گئی ہیں"[۱]۔ نثر میں استعمال ہونے

---

[۱] "PROSE IS AN INSTRUMENT WHOSE RANGE IS INFINITE, AND PROBABLY ITS POSSIBILITIES HAVE BEEN LESS

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴ پر)

والا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ اس طرح اثر کرتا ہے کہ ان لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ شاعری کی طرح نثر سے جذبات میں کسی قسم کے ہیجان اور ہلچل کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھوں تو اعصاب اور دل و دماغ میں ایک طرح کی تہذیب پیدا ہوتی ہے اور یہی نثر نگاری، اور خصوصاً ادبی نثر نگاری، کا اہم کارنامہ ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نثر میں شاعری بھی کی جا سکتی ہے اور اس کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ادبی تاریخ میں شاعرانہ نثر کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں اور اس انداز کا اثر بھی بڑا گہرا ہوتا ہے۔ ایسی نثر جذبات کو بھی متاثر کرتی ہے اور ذہن پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کی نثر کا تخلیق کرنا صرف ایسے گنے چنے نثر نگاروں کا کام ہے جن میں جذبے کی فراوانی ہو اور جو تخیل سے کام لینا جانتے ہوں۔ تجربے میں شدت کے بغیر یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ تجربے کی اس شدت میں جو موضوع تپ کر نکلے گا، اس کا اظہار شاعرانہ رنگ و آہنگ اختیار کر سکتا ہے۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو نثر میں الفاظ ابھری ہوئی شکلوں اور پیکروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں مخصوص در و بست اور ایک مخصوص آہنگ پیدا ہو جاتا ہے، اور نغمگی اور موسیقیت کی کیفیت اس میں ابھری ہوئی نظر آنے لگتی ہے لیکن نثر میں یہ کیفیت صرف الفاظ کے استعمال سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی تہ میں تو تجربہ ہونا چاہیئے۔ تجربہ نثر نگار کے ہاں الفاظ میں زندگی پیدا کرتا ہے اور وہ زندہ تصویروں اور پیکروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور ان میں مخصوص در و بست سے وہ آہنگ پیدا ہو جاتا ہے جو تجربے کے مخصوص آہنگ کی عکاسی کرتا ہے۔ بڑے نثر نگار اس تخلیقی انداز سے اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت

(صفحہ ۱۳ کا بقیہ حاشیہ)

EXPLORED THAN POETRY."

JOHN MIDDLETON MURRY: THE PROBLEM OF STYLE, P68.

رکھتے ہیں۔ اسی لئے نثر کے مختلف نقادوں نے اس صورت حال کو اعلیٰ درجے کی نثر کے لئے ضروری قرار دیا ہے؟ لوکس (F.L. LUCAS) نے تو اپنی کتاب (STYLE) میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "ہر اچھے اور معیاری نثر نگار کو اپنی نثری تخلیق کو باآواز بلند پڑھنا چاہیے تاکہ اس کو یہ اندازہ ہو کہ جس نثری آہنگ کی وہ تخلیق کر رہا ہے وہ اس کے تجربے سے مناسبت رکھتا ہے یا نہیں"[1]

غرض یہ کہ نثر نگاری ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ شاعری سے مختلف چیز ہے لیکن اس کا دائرہ کار شاعری کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ وہ انسان کے ذہن و فکر پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی منفرد جمالیاتی اقدار سے احساسِ جمال کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔

۳

اس کا مطلب یہ ہے کہ نثر نگاری اپنی ایک مخصوص ہیئت، فارم اور تکنیک رکھتی ہے۔ اس کے بغیر نثر کو نثر تو کہا جا سکتا ہے لیکن ادبی نثر نہیں کہا جا سکتا۔ ارسطو نے اپنی کتاب RHETORIC میں لکھا ہے کہ "اسلوبِ نثر میں ایک فارم ضرور ہونا چاہئے کیونکہ فارم کے بغیر نثر مؤثر نہیں ہوتی، بلکہ برے اثرات چھوڑتی ہے۔"[2]

ارسطو کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہر ادبی نثر مجموعی طور پر اپنی ایک ہیئت ضرور رکھتی ہے اور بنیادی طور پر اس کی تخلیق کا عمل ہی نثر نگار کے ہاں ایک اسلوبِ نثر کو پیدا کرتا ہے۔ اس اسلوب کے بغیر ادبی نثر کا پڑھنا ایک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایسی نثر کو پڑھ کر طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے پر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں ہوتا۔

---

[1] F.L. LUCAS : STYLE, P. 190

[2] ARISTOTLE : PHETORIC., III, 8.

اسلوب کے بارے میں مختلف تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بوفاں (BUFFON) فلابیئر (FLAUBERT) اور اسٹنڈال (STENDAL) کی تعریفیں بہت مشہور ہیں۔ اسلوب پر بیشتر لکھنے والوں نے انھیں کا حوالہ دیا ہے اور ان کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ان میں جسزدی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان سب نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اسلوب، لکھنے والے کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے اور یہ کہ لکھنے والا اپنے اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ شخصیت کی تمام خصوصیات سمٹ کر اسلوب میں اس طرح یکجا ہو جاتی ہیں کہ اسلوب کے آئینے میں لکھنے والا پوری طرح چلتا پھرتا اور ہنستا بولتا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں حسن کی ایسی اقدار پیدا ہو جاتی ہیں جو دلوں پر اثر کرتی ہیں اور ان سے احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

یہ اسلوب خیال کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ خیال ہی اس کی بنیاد ہے، خیال ہی اس کا منبع ہے اور خیال ہی اس کا سرچشمہ ہے۔ خیال جب تجربے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور لکھنے والا جب اس تجربے کا اظہار و ابلاغ کرتا ہے تو اسلوب کی تشکیل عمل میں آجاتی ہے۔ یہ خیال ہی لکھنے والے کا کوئی جذباتی یا ذہنی تجربہ ہوتا ہے جس کو وہ دوسروں تک پہونچاتا ہے۔ اس احساس کی وجہ سے خیال کا اظہار اس کے یہاں ایسی صورت اختیار کرتا ہے جو حد درجہ متاثر کرنے والی ہوتی ہے۔ اس طرح ایک طرف تو اس تجربے کی حقیقت پڑھنے والے پر ظاہر ہو جاتی ہے اور دوسری طرف وہ اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔ اسلوب کی تشکیل تخلیقِ ادب کی جان ہے اور اسی پیمانے سے ادیب کو پہچاننے اور اس کے مرتبے کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلوب کو سمجھنا اور اس کا تجزیہ کرنا جمالیات اور تنقید کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھے بغیر ممکن نہیں۔

بعض لوگ اسلوب کو صرف آرائش و زیبائش کا عمل سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلوب تو انسان کی پوری شخصیت کا عکس ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے، اس کو بیان کرتا ہے

اور اس طرح دوسروں تک پہونچتا ہے، لیکن صرف دیکھنے اور سوچنے ہی سے اسلوب کی تشکیل نہیں ہوتی۔ اسلوب اس وقت تشکیل پاتا ہے جب دیکھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے والا اس چیز کی تہ تک پہونچ جائے، اس میں گم ہو جائے اور اس کو اپنی شخصیت کا جزو بنالے۔ ایسے لکھنے والوں کے یہاں اسلوب ان کے دیکھنے کے مخصوص انداز اور سوچنے کے مخصوص زاویۂ نظر کا نام ہے

مشہور روسی افسانہ نگار اور صاحب طرز انشا پرداز چیخوف نے ایک دفعہ گورکی سے کہا تھا کہ "آپ فن کار ہیں، ایک اسلوب کے مالک ہیں، کیونکہ آپ شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ آپ چیزوں کو صرف دیکھتے ہی نہیں، ان کو اپنے ہاتھ سے چھوتے بھی ہیں۔ صحیح معنوں میں لکھنا یہی ہے"؛ [۱]

چیخوف نے ان چند فقروں میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لکھنے کو تو سب ہی لکھتے ہیں، خامہ فرسائی تو ہر شخص کرتا ہے، لیکن جس کو ہم صحیح معنوں میں تحریر اور ادبی تحریر کہتے ہیں اور جس میں ایک اسلوب نمایاں نظر آتا ہے، اس کی تخلیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مشاہدے کو محسوسات کے ساتھ ہم آہنگ نہ کردے، جب تک وہ چیزوں میں اپنے آپ کو گم کر کے ان کی ماہیت کو نہ جان لے اور ان کی اتھاہ گہرائیوں میں نہ اتر جائے، کیونکہ صرف اسی طرح بقولِ فلابیر (FLAUBERT) الفاظ میں وہ روح پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ زندہ اور جان دار معلوم ہوتے ہیں۔

جب تحریر اس صورت حال سے ہمکنار ہو جائے تو صحیح معنوں میں اسلوب پیدا

---

[۱] "YOU ARE AN ARTIST —— YOU FEEL SELPERBLY, YOU ARE PLASTIC; THAT IS WHEN YOU DESCRIBE A THING, YOU SEE AND TOUCH IT WITH YOUR HANDS. THAT IS REAL WRITING ——" TCHEHOV.

[۲] اقبال نثر

ہوتا ہے جس کو ادیب اور لکھنے والے کا تخلیقی کارنامہ سمجھنا چاہیئے ۔ اس کا مقصد لوگوں کو جاننا پہچاننا، ان کے ساتھ جذباتی و ذہنی رابطہ پیدا کرنا، ان سے قریب ہونا، ان کو اپنے خیالات اور جذبات و احساسات سے آشنا کرنا اور اس کے اظہار سے لوگوں کے حساس جمال کو تسکین پہنچانا، اور اس طرح انھیں محظوظ کرنا۔

۴

نثر کی ہئیت، فارم یا تکنیک اسی اسلوب کا دوسرا نام ہے۔ اگر نثر میں اسلوب کی وہ خصوصیات پیدا ہو جائیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے تو وہ ادبی نثر ہے اور اس نثر کا لکھنا ایک تخلیقی عمل ہے۔

ادبی نثر کی تخلیق میں بنیادی چیز خیال ہے جس کو موضوع یا تجربہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال جذبے کے بغیر وجود اختیار نہیں کر سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ ادب میں۔ ادب میں کوئی خیال بغیر جذبے اور احساس کے پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ادبی نثر بغیر اس جذبے اور احساس کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جذبے اور احساس کے بغیر خیال معلومات تو فراہم کر سکتا ہے، حقائق سے پردہ تو ہٹا سکتا ہے لیکن دل، دماغ اور اعصاب پر وہ اسی وقت اثر کر سکتا ہے جب اس کی تہ میں جذبے کی گرمی اور روشنی ہو۔

بعض لوگوں کا خیال رہا ہے کہ نثر صرف سیدھے سادے حقائق اور معاملات و مسائل کو پیش کرتی ہے۔ اگر جذبہ اس میں شامل ہو جائے تو پھر اس کو شاعری کی سرحدوں میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ اس عالم میں تخلیقی فن کار تجربے کے اظہار کے لئے شاعری کو اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خیال اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن ایک صورت یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ لکھنے والے کا جذبہ اور اس کا عمل خود نثر میں وہ آہنگ پیدا کر لے جو جذبے کے آہنگ سے مناسبت رکھتا ہو، اور جس میں صرف آہنگ سے اس کیفیت کا اظہار ہو جس سے وہ دوچار رہے۔

ایسی نثر ہر زمانے میں لکھی گئی ہے اور اسی صورت حال نے اس کو ادبی اور تخلیقی نثر بنایا ہے۔

اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے نثر کے فن کار کے پاس شدید احساسِ توازن کا ہونا لازمی ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ شدتِ جذبات کے زیر اثر وہ اپنی نثر کو شاعری بنا دے یا پھر نثر کو چھوڑ کر جذبے کی ترجمانی کے لئے شاعری کرنے لگے۔ ادبی نثر کی بنیاد جذبہ ضرور ہے، لیکن نثر نگار کا ذہن اس جذبے کو اپنے حدود میں رکھتا ہے، حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتا۔ چونکہ اس کے یہاں عقل اور ذہن جذبے کو اپنے حدود میں رکھتے ہیں اسی لئے وہ اپنے موضوع میں زیادہ استواری پیدا کر لیتا ہے، کیونکہ یہ صورت حال، جس کا اوپر ذکر ہوا، اسکو صرف ہوائی قلعے تعمیر کرنے تک محدود نہیں کرتی بلکہ موضوع میں ذہنی و فکری اعتبار سے وزن پیدا کرتی ہے اور اس طرح اس کے موضوع اور تجربے میں استواری کے ساتھ دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔

دوسرے فن کاروں کی طرح ادبی نثر نگار کا بنیادی کام بھی اپنے موضوع اور تجربے کا اظہار و ابلاغ ہے۔ اس کے لئے وہ الفاظ اور زبان سے کام لیتا ہے۔ ادبی نثر اظہار و ابلاغ کے لئے زبان کے صحیح، مناسب اور متناسب الفاظ کے استعمال کا تقاضا کرتی ہے۔ صحیح اظہار و ابلاغ موضوع اور الفاظ و زبان کی ہم آہنگی کا پابند ہوتا ہے۔ یہی پیمانہ ہے جس سے نثر نگار کے تخلیقی عمل کی اندازہ دانی کی جا سکتی ہے اس کے اسلوب کو مکمل اور مثالی اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب وہ اس ہم آہنگی کے عمل سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکے اور اپنے تجربے کو صفائی اور صحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچا سکے۔ نثر کی تکنیک اور تخلیقی عمل میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن نثر میں صحت اور صفائی کے ساتھ خیال یا تجربے کے اظہار و ابلاغ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو صرف سیدھے سادے بیانیہ انداز میں پیش کر دیا جائے۔ اس کا مطلب تو تجربے اور خیال کی صحت اور صفائی کے ساتھ وضاحت ہے

اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تجربہ واضح ہو، خیال میں کوئی پیچیدگی نہ ہو اور جذبہ الجھا ہوا نہ ہو۔ یہی کیفیت زبان اور الفاظ کے صحیح استعمال اور خیال اور تجربے کو واضح کرنے کے لئے زمین تیار کرتی ہے۔ نثر نگاری کے فن کا یہ طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے کہ اس میں اظہار و ابلاغ واضح ہو، زبان صاف اور سادہ ہو، الفاظ کا استعمال اس طرح ہو کہ مفہوم کو سمجھنے میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔ ابہام اور پیچیدگی نظم اور شاعری میں تو کسی حد تک گوارا کی جا سکتی ہے لیکن نثر کے لئے قابلِ برداشت نہیں۔ یہ صورت تو اس کے آئینے کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شعری تجربہ جذبے اور احساس کی تہ در تہ کیفیت کا نام ہے۔ بعض اوقات شاعر پر کبھی یہ تجربہ پوری طرح روشن اور واضح نہیں ہوتا اسی لئے اس کے ہاں اظہار و ابلاغ میں ابہام کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن نثر کی تخلیق میں فن کار کا اس صورت حال سے دوچار ہونا ضروری نہیں، کیونکہ نثر لکھتے ہوئے وہ صرف جذبے اور اس کی تہ در تہ اور پر پیچ کیفیت کو پیش نہیں کرتا بلکہ جذبے کے ساتھ ذہن سے بھی کام لیتا اور اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ خواہ وہ کسی پیمانے کے جذبے کی نثر میں ترجمانی کرے، عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا۔

لیکن نثر کے فن میں اس توضیحی، تشریحی اور بیانیہ انداز کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں بہت زیادہ اور غیر معمولی تفصیل ہو۔ برخلاف اس کے اس انداز میں تو جامعیت کے ساتھ اختصار ضروری ہے، کیونکہ جب اختصار ہوتا ہے تو الفاظ کی معنویت زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے اور ان میں ابھار کی کیفیت صوتی آہنگ کے ساتھ مل کر ایسی تصویروں کی تخلیق کرتی ہے جو منہ سے بولتی ہیں اور اشاروں اور کنایوں میں کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہتی ہیں۔ اس طرح نثر میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے اثر کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ مشہور روسی افسانہ نگار چیخوف کو اس اعتبار سے نثر لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے کسی افسانہ لکھنے والے کے ایک افسانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے

یہ کہا تھا "چاندنی کے بارے میں آپ نے جو صفحات لکھے ہیں انھیں نکال دیجئے اور اس کی بجائے ہمیں اپنے جذبات و احساسات کی کیفیت سے آشنا کیجئے؛ اس طرح جیسے چاند ایک ٹوٹی ہوئی بوتل میں اپنا عکس ڈالتا ہے"۔ اسی طرح دوستوسکی نے ایک لکھنے والے کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "اس نے سڑک پر پیسے پھینکنے کا جو ذکر کیا ہے اس کو ایسا ہونا چاہیئے پیسوں کی کھنکھناہٹ پوری طرح کانوں میں گونجے اور ان کے گرنے اور چلنے کی آواز حواس پر چھا جائے"۔ [۵]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ادبی نثر میں رمز و ایما کی کیفیت بھی اہم کام کرتی ہے اور ساتھ ہی الفاظ کا صوتی آہنگ بھی بڑا اہم کام انجام دیتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے نثر نگار کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کو علامتوں کا روپ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور الفاظ کے مناسب اور متناسب استعمال سے وہ صوتی آہنگ پیدا کر دیتا ہے جس سے تجربے کی کیفیت آواز کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ایک خاص طرح کی نغمگی اور موسیقیت نثر نگاری کے فن کو اس کی انتہائی بلندیوں پر پہونچا دیتی ہے۔ مجموعی طور پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بات واضح ہو جاتی ہے، خیال دل میں اتر جاتا ہے، تجربہ حواس پر چھا جاتا ہے اور فن کار پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ پڑھنے والے پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔

نثر میں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی اس کے اثر کو بڑھاتا ہے لیکن ان تشبیہات و استعارات کو نثر نگاری کے فن کا زیور تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو اسلوب نثر کی اس کیفیت کے اثر کو بڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جس کو اس سے قبل توضیح و تشریح اور اظہار و ابلاغ کی تکمیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بغیر کسی مقصد یا بغیر کسی تجربے کی ترجمانی کے اگر خواہ مخواہ صرف آرائش و زیبائش کے طور پر نثر میں تشبیہات و استعارات کی بھرمار ہو تو اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اگر فطری طور پر تشبیہات و

---

۵ JOHN MIDDLETON MURRY: THE PROBLEM OF STYLE, P. 78.

استعارات تجربے یا خیال کے اظہار و ابلاغ کے لئے نثر میں آجائیں تو وہ اس کے حسن میں اضافے کا باعث بنتے ہیں اور ان کی وجہ سے نثر میں صحیح قسم کی رنگینی اور پرکاری پیدا ہو جاتی ہے۔

زبان پر قدرت نثر نگار کے لئے ضروری ہے کہ یہی قدرت ان تمام اصولوں اور معیاروں کو برتنے کے لئے اس کو آمادہ کرتی ہے جن کی وجہ سے اس کی نثر کو فن کا مقام حاصل ہوتا ہے اور وہ تخلیقی انداز کی نثر کہلاتی ہے۔ لیکن زبان کا استعمال آسان کام نہیں ہے۔ جو شخص زبان کے اصول و قواعد جانتا ہے وہ صحت کے ساتھ زبان کو استعمال تو کر سکتا ہے، لیکن موضوع کی مناسبت سے زبان کا استعمال مشکل کام ہے۔ اس کے لئے ان اصولوں اور معیاروں کا شعور ضروری ہے جو نثر نگاری کو صحیح معنوں میں نثر نگاری بناتے ہیں اور جن کی وجہ سے اس کو فنی تخلیق کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

غرض نثر نگاری ایک فن ہے۔ اس کے کچھ بنیادی اصول اور معیار ہیں۔ ان اصولوں اور معیاروں کو برتنے والا ہی صحیح معنوں میں نثر نگار بلکہ نثر کا تخلیقی فن کار ہے۔

علامہ اقبال کی نثر میں نثر نگاری کے یہ اصول اور معیار بدرجۂ اتم ملتے ہیں، اسی لئے اس میں ایک تخلیقی رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔

دوسرا باب

عہد اقبال میں اردو نثر کے رجحانات

(روایت اور تجربے)

۱

جدید تحقیق کے مطابق علامہ اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ بیس بائیس سال کی عمر میں انھوں نے شاعری اور نثر نگاری دونوں میں اپنے تخلیقی کارنامے پیش کرنے شروع کئے اور چند ہی سال کے اندر ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا۔ کم ازکم چالیس سال تک وہ تخلیقی کام کرتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے نہ صرف شاعری اور نثر کا بہت بڑا سرمایہ جمع کرلیا بلکہ اپنے فکر وفن سے اپنے زمانے کے ادبی ماحول کو متاثر بھی کیا۔ یہ اثرات بڑے ہی وسیع اور ہمہ گیر تھے، اور ان کی وجہ سے ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جو تبدیلی آئی، اس کی مثال ہماری فکری و ذہنی تاریخ میں کہیں اور ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ ملت اسلامیۂ ہند کی سیاست، معاشرت، تہذیب و ثقافت، فکر و فلسفہ، ادب و شعر سب میں اقبال کے فکر وفن کے اثرات اتنے وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کی مکمل اندازہ دانی بھی کوئی

آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس طرح سرایت کر گئے ہیں کہ ان کا بنیادی جز معلوم ہوتے ہیں۔

اسی لئے اسلامیانِ ہند کی ذہنی وفکری، معاشرتی وتہذیبی اور ادبی وفنی تاریخ میں بیسویں صدی کے تقریباً پچاس برسوں کو عہدِ اقبال سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ اپنے علمی وادبی کام کا آغاز انھوں نے انیسویں صدی کے آخر ہی میں کر دیا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو اقبال کا کام تقریباً پینتالیس پچاس سال پہ پھیلا ہوا ہے۔ اور پھر چونکہ اس کام کے اثرات مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بہت گہرے ہوئے ہیں اسلئے اس زمانے کو عہدِ اقبال ہی کہنا مناسب ہے۔

علامہ اقبال نے جب آنکھ کھولی تو عہدِ سرسید کے اثرات اپنے شباب پر تھے اور اسلامیانِ ہند کی زندگی کا قافلہ سرسید ہی کی تحریک کا دامن پکڑ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اقبال نے بھی سرسید کے افکار وخیالات سے اثر قبول کئے، ان کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا اور انھیں بنیادوں پر انھوں نے ایک ایسی عمارت تعمیر کی جو ان کی زندگی ہی میں ہمدوش ثریا نظر آنے لگی۔ سوائے اقبال کے کسی دوسرے شاعر اور فن کار کو یہ مرتبہ نصیب نہیں ہوا کہ اس کا کلام گھر گھر پڑھا جائے، اس کے فکری نظام اور شعر و ادب سے نہ صرف عام مسلمان بلکہ بڑے بڑے سیاسی رہنما تک متاثر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتِ اقبال کی تقریباً نصف صدی کا زمانہ ایسا ہے جس کے لئے صرف عہدِ اقبال ہی کی اصطلاح استعمال ہونی چاہیئے۔

۲

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انیسویں صدی کا زمانہ اور پھر بیسویں صدی کے تقریباً پینتالیس پچاس سال اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی

زمانے میں مسلمانوں نے شکست کھانے کے بعد زندہ رہنے اور زیست کرنے کے آداب سیکھے سیاست کا شعور اپنے اندر پیدا کیا اور جگر لخت لخت کو جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ تالیفِ نسخہ ہائے وفا کا سامان پیدا ہو سکے۔ ایک ولولۂ تازہ دلوں میں پیدا کیا جس کی وجہ سے جدوجہد کا خیال دلوں میں جاگزیں ہوا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کے خیالات کی لہریں دلوں میں اٹھنے لگیں۔ دین میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کا احساس عام ہونے لگا۔ تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کے تصورات پھیلنے لگے۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کو نئے حالات سے ہم کنار کرنے کا شعور ہر فرد کے یہاں نظر آنے لگا، روشن خیالی عام ہونے لگی، سائنس اور فلسفے کے اثرات بڑھنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کو سرسید اور ان کے رفقا کی تحریک نے عام کیا، چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر دیکھتے ہی دیکھتے چند سال کے عرصے میں ہندوستان کی مسلم سوسائٹی ایک نشاۃ ثانیہ سے دوچار ہوگئی جس کا سلسلہ بیسویں صدی تک جاری رہا۔ سرسید اور ان کے رفقا کے بعد اپنے عہد میں اقبال اس نشاۃ الثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے۔

اسلامیانِ ہند کی نشاۃ الثانیہ کی اس تحریک نے سرسید اور ان کے رفقا کی تصانیف کو پیدا کیا اور ان تصانیف نے سیاست، ثقافت، تعلیم، دین، مذہب، تاریخ، معاشرت، تہذیب، زبان اور ادب سب کو نشاۃ الثانیہ کے رنگ میں رنگ دیا۔ خود سرسید نے مختلف اور متنوع موضوعات پر اپنی نثری تصانیف پیش کیں۔ انھوں نے اپنی تاریخ، تہذیب و ثقافت، دین اور مذہب، معاشرت، تعلیم اور اخلاق سب ہی موضوعات پر لکھا۔ ان کی تصانیف دیکھئے:- (۱) جام جم۔ (۲) انتخاب الاخوین۔ (۳) جلاء القلوب۔ (۴) تحفۂ حسن۔ (۵) تسہیل فی جر الثقیل۔ (۶) آثار الصنادید۔ (۷) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار۔ (۸) قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین (۹) کلمۃ الحق۔

(۱۰) راہِ سنت در ردِ بدعت۔ (۱۱) نمیقہ۔ (۱۲) سلسلۃ الملوک۔ (۱۳) کیمیائے سعادت۔ (۱۴) آئینِ اکبری۔ (۱۵) تاریخ سرکشیٔ بجنور۔ (۱۶) اسبابِ بغاوتِ ہند۔ (۱۷) تحقیقِ لفظِ نصاریٰ۔ (۱۸) تبیین الکلام۔ (۱۹) سفرنامۂ لندن۔ (۲۰) خطباتِ احمدیہ اور (۲۱) تفسیر القرآن۔ یہ کتاب اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا لیکن یہ موضوعات کسی نہ کسی زاویے سے اسلام اور مسلمانانِ ہند کے معاملات و مسائل کے ساتھ ضرور تعلق رکھتے ہیں۔

سرسید نے ان معاملات کو پیش کرنے کے لئے آسان اور سادہ اُردو کو استعمال کیا۔ فارسی کا اس زمانے میں خاصا رواج تھا، علماء عربی بھی استعمال کرتے تھے، اس لئے بعض مختصر کتابیں اور رسالے انھوں نے فارسی اور عربی میں بھی لکھے، لیکن ان کا بیشتر کام آسان اور سادہ اُردو زبان میں ہے، اس لئے کہ وہ اپنے خیالات کو عام کرنا چاہتے تھے۔ صرف ادب کی تخلیق ان کا مقصد نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسا اسلوب پیدا کیا جس میں سادگی اور روانی تو ہے لیکن ادبیت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود سرسید کا اسلوبِ نثر اردو نثر کی روایت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ انھوں نے علمی اور دینی موضوعات کو پیش کرنے کے لئے ایک ایسے انداز کو اختیار کیا جس میں تصنع، تکلف اور بناوٹ کے عناصر نہیں تھے۔ برخلاف اس کے ایک سیدھا سادہ اندازِ بیان تھا جس کو مقصدی اور افادی انداز بیان کہا جاسکتا ہے

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سرسید نے اس اندازِ بیان اور اسلوبِ نثر کو پیدا کر کے اردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ ان کے رفقا نے ان کے اس اسلوب کی پیروی کی اور اس کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حالی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، شبلی، محسن الملک اور وقار الملک، چراغ علی، اگرچہ

اپنی اپنی انفرادیت بھی رکھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ سب کے سب سرسید ہی کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلوب کے اس افادی رجحان میں علمیت کی وجہ سے کسی قدر خشکی کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن اس میں اقلیت پسندی نے ایک زور دار کیفیت ضرور پیدا کر دی ہے۔ اسکے علاوہ حالی، ذکاء اللہ، محسن الملک اور وقار الملک کے یہاں سادگی اور روانی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے یہاں زبان۔ محاورے کی چاشنی کے لطیف امتزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اسلوب کا ایک نیا انداز پیدا کرتی ہے۔ شبلی کے یہاں اسی اسلوب میں رنگینی اور پرکاری کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں، اس لئے کہ وہ مزاج کے اعتبار سے رومانی تھے۔

غرض یہ کہ سرسید کی تحریک کے زیر اثر اردو میں ایک ایسا اسلوب نثر پیدا ہوا جس میں علمی رنگ و آہنگ زیادہ نمایاں تھا، جس میں عقلیت اور منطقیت زیادہ ابھری ہوئی تھی، لیکن جس میں سادگی اور روانی کی خصوصیات موجود تھیں اس میں جذبے اور تخیل سے پیدا ہونے والی رنگینی نہ ہونے کے برابر تھی۔ زبان اور بیان کا حسن اس میں یقیناً موجود تھا اور اس کے علم بردار حالی، ذکاء اللہ اور نذیر احمد ہیں۔ ایک غیر معمولی سنجیدگی کی چھاپ اس اسلوب پر بہت نمایاں ہے۔ صرف نذیر احمد اور شبلی نے کسی حد تک اس سے انحراف کیا ہے اور وہ اپنے اپنے راستے الگ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں: نذیر احمد نے اپنی طبیعت کی شگفتگی اور شبلی نے اپنے مزاج کی رنگینی سے عہد سرسید کے اسلوب میں کچھ تنے گل بوٹے کھلائے اور اس کو خاصی حد تک دلوں میں اتارنے اور جو اس پر چھا جانے کا سامان بھی پیدا کیا۔

سرسید نے اپنے عہد کے اسلوب نثر اور نثری روایت کے بارے میں "تہذیب الاخلاق" میں یہ چند جملے لکھے تھے۔ اس سے بہتر جائزہ اس عہد کے

اسلوبِ نثر کی روایت کا کسی اور نے پیش نہیں کیا اس لئے ان جملوں کو یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں :

"جہاں تک ہو سکا، ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کم فہم زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے، جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے۔ اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا تک بندی سے، جو اس زمانے میں مصفّا عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"[1]

عہد سرسید کے اسلوب نثر کی روایت انھیں خیالات کی صحیح تصویر ہے

۳

سرسید کے اس اسلوب کی روایت کے اثرات اردو میں بیسویں صدی میں بھی جاری رہے بیسویں صدی کے آغاز سے قبل سرسید تو اس دنیا سے اٹھ گئے لیکن نذیر احمد، حالی اور شبلی بیسویں صدی میں بھی مرتے دم تک تخلیقِ نثر کے کام میں مصروف رہے۔ اس طرح علمی نثر لکھنے کی روایت ان کے دم سے قائم اور باقی رہی اور ان کے اثر سے لکھنے والوں کا خاصا بڑا حلقہ پیدا ہو گیا جس میں سرسید اور حالی کی پیروی کرنے والوں میں ڈاکٹر مولوی

---

[1] سرسید : تہذیب الاخلاق، ۱۲۹۱ھ

عبدالحق اور سر عبدالقادر اور شبلی سے متاثر ہونے والوں میں سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

سر عبدالقادر کا "مخزن" جب ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا تو اس وقت سر سید کی تحریک نے اردو میں تخلیق ادب کا ایک ماحول پیدا کر دیا تھا اور نثر لکھنے کی ایک فضا قائم ہو گئی تھی۔ "مخزن" کی تحریک میں سر سید کے اثرات کسی نہ کسی حد تک نمایاں تھے چنانچہ آسان، سادہ اور رواں نثر "مخزن" کے لکھنے والے بھی لکھ رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے یہاں ایک تبدیلی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ روایت سے ایک طرح کی بغاوت کی جھلک بھی نظر آنے لگی تھی۔ یہ رومانیت کا آغاز تھا۔ اس رومانی انداز کی بنیاد تو شبلی کے اسلوبِ نثر نے سر سید ہی کے زمانے میں رکھ دی تھی اور یہ سر سید کی تحریک اور ان کے اسلوبِ نثر کے افادی رجحان کے خلاف ایک ردعمل تھا لیکن سر سید کے زمانے میں اس کی حیثیت ایک تجربے سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے روایت کی صورت تو "مخزن" کی تحریک کے زمانے میں اختیار کی اور بہت تھوڑے عرصے میں اس انداز نے اردو میں ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس تحریک کے علم برداروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس برسوں میں یہ دونوں رجحانات اردو نثر میں جاری رہے۔ خود "مخزن" میں ان دونوں رجحانات کا سنگم نمایاں تھا کیونکہ ان دونوں رجحانات کے علم بردار اس رسالے میں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان لکھنے والوں کا دائرہ کار سر سید اور ان کی تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں کے دائرہ کار سے مختلف تھا۔ ان کے موضوعات بھی مختلف اور متنوع تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے، انشائیے بھی تخلیق کئے، کہانیاں بھی لکھیں، خاکے اور رپورتاژ لکھنے کا تجربہ بھی کیا۔ غرض انھوں نے اس اعتبار سے اردو نثر کو وسعت دی اور ساتھ ہی سادہ اسلوب نثر کے ایسے رنگین اور

پرکار اسلوب کی داغ بیل ڈالی جس کا ہیولا جذبے اور تخیل کی ہم آہنگی سے تیار ہوتا ہے اور جس کو تنقیدی اصلاح میں رومانی اسلوب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سر شیخ عبدالقادر "مخزن" کے نامور مدیر تھے۔ انھوں نے اپنے اس رسالے کو ایک ادبی تحریک بنا دیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادبی انسان تھے۔ انھوں نے "مخزن" کو مرتب ہی نہیں کیا، صرف اس وقت کے لکھنے والوں سے مضامین ہی نہیں لکھوائے، ادب اور خصوصاً ادبی نثر کی تخلیق کے لئے لکھنے والوں کا ایک حلقہ ہی پیدا نہیں کیا، خود بھی مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے میں پیش پیش رہے۔ ان کے موضوعات سرسید اور ان کے رفقا کے مقابلے میں زیادہ متنوع ہیں لیکن اسلوبِ تحریر سرسید کے اسلوب سے زیادہ قریب ہے۔ ان کے یہاں وہی سادگی، صفائی اور روانی ہے جو سرسید کے اسلوبِ نثر میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور جس نے اردو نثر کی روایت کو ایک نئے انداز اور ایک نئے آہنگ سے آشنا کیا تھا۔

"انتخابِ مخزن" کے نام سے رسالہ "مخزن" میں شائع ہونے والے مضامین کا جو انتخاب شائع ہوا ہے اس کا حصۂ سوم سر شیخ عبدالقادر کے مضامین نثر پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کے عنوانات یہ ہیں: — بناوٹ اور سادگی، مجالس تفریح، فن تنقید، جوہر فصاحت، نظم آزاد، زندہ دلوں کا وطن، عورتوں میں ہمدردی، سید محمد کاظم حبیب، ہیرا انجھا، کیا رسم ستی بند ہو گئی؟ نقش اور رنگ، تصویر کے دو رخ، جشن تاج پوشی، اہل قلم کی طرف سے مبارک باد، بے سروسامانی، دربار اعظم، حیات جاوید پر ایک تنقیدی نظر، بن کھلے مرجھا گئے، انجمن اُردو، اطالین نمائش، مدفن بزرگان، ہربرٹ اسپنسر، کشتی اور طوفان، پولیٹیکل ڈراما، دوسرے روز آشنائی بہ شناختن نیرزد، حریت اور آزادی، گل بازی یا گل بازی، کان کنی کے شہید، گھر سے نکل کر دیکھو وغیرہ وغیرہ۔ ان میں انشائیے بھی ہیں، معلوماتی مضامین بھی اور تنقیدی شذرات بھی —— اور اندازِ تحریر یہ ہے۔

"جو لوگ سادگی کے نظاروں سے آشنا ہیں وہ بناوٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر بناوٹ کے شیدائی بھی کیا کریں۔ اس دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ رہنا، یہ بھی تو ہر کسی کا کام نہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ایک ادنیٰ نمونہ اس بڑی مثال کا دکھا رہے ہیں جو دنیا نے ان کے لئے قائم کی ہے۔ پرانے شعراء اور مصنفین کی تحقیق متفق اللفظ ہو کر گواہی دے رہی ہے کہ دنیا جس کے حسنِ دل فریب کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا مبتلا ہیں۔ اصل میں ایک زال پیر ہے جو صرف خط و خال کی آرائش سے لوگوں کے دلوں کو لبھا کر دامِ تزویر میں لا رہی ہے۔ اور اگر اس کے چہرے سے وہ پوڈر سرخی، جو اس کی زینت ہے، دھو ڈالی جائے اور اس کے مصنوعی کالے اور لمبے بال اکھاڑ پھینکے جائیں اور اس کے بناوٹی سفید دانتوں کی لڑی، جو یہ کسی متنفس کے روبرو نہیں اتارتی، نکال باہر کی جائے اور اس کی اصلی شکل کسی کو دکھا دی جائے تو پھر اس کے شیدائی اس سے قطع تعلق کر لینا تو کیا، کسی حسین کے حسن پر اعتبار نہ کریں اور سب سے کنارہ کش ہو کر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں بس جب یہ دنیا بذات خود ایک بڑا دامِ تزویر ہے جو اس عالم پر پھیلا ہوا ہے تو وہ لوگ جو اس بڑے دام کے نیچے چھوٹی چھوٹی جالیاں لگاتے ہیں معذور ہیں اور جو بیچارے ناداستہ ان چھوٹے پھندوں میں پھنستے ہیں وہ معذور تر۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ بناوٹ کا پھندا بڑا زبردست پھندا ہے، جسے دیکھو اس کا شکار ہے۔ عشاق ہیں تو زلفوں کے پیچ و خم کے پھیر میں، شعراء ہیں تو کلام میں تلازم کی تلاش میں، واعظ ہیں تو ناز و کرشمہ بر سر منبر کے انداز سوچ رہے ہیں، مضمون نگار ہیں تو انھیں قافیہ بندی کی دھن لگی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جس کی زلفِ پُر پیچ کے دیوانے ہیں، وہ اس قابل

بھی نہیں ہے کہ اسے چاہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ جس کلام کو تلازم کے
نمک مرچ سے لطیف بنا رہے ہیں، وہ کسی ذاتی صفت سے متصف ہے یا نہیں۔
کوئی غور نہیں کرتا کہ دغظ میں نکات بھی دلپذیر ہیں یا محض انداز ہی کی فکر
اور کوئی نہیں پروا کرتا کہ قافیہ بندی کی دھن میں کہیں اصل مضمون ہی
خراب نہ ہو جائے"۔ [1]

سر شیخ عبدالقادر کی اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ادبی نثر لکھنے کا سلیقہ
رکھتے تھے۔ ان کے پاس سادگی اور بناوٹ کے فرق کا گہرا شعور تھا۔ وہ سادگی کو پسند
کرتے تھے اور اس کے حسن کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے اس اندازِ نثر میں بھی
سادگی ہے، وہی سادگی جو سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھی تھی۔ لیکن اس
میں تخیل سے پیدا ہونے والی اس رنگینی کے رنگ بھی جگہ جگہ دوڑے ہوئے ہیں جو ان کے
اس اندازِ تحریر کو پرکاری سے ہم کنار کرتے ہیں اور جس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ
'مخزن' کی تحریک میں رومانیت کا جو رنگ و آہنگ تھا، اس کے ہاتھوں سر عبدالقادر
کے اسلوب میں بھی رنگین کاری کی ایک نئی دنیا پیدا ہو رہی تھی۔ اس میں تشبیہات و
استعارات فطری انداز میں اپنا جو جلوہ دکھا رہے ہیں وہ جذبے اور تخیل کی
آمیزش سے پیدا ہونے والی پرکاری کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ اندازہ
ہوتا ہے کہ سر عبدالقادر بھی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے اور یہ کہ ان کی
تحریروں نے ایک نئے اندازِ نثر کی داغ بیل ڈالی جو سرسید کی نثر سے قریب
ہونے کے باوجود اس سے مختلف تھی۔

'مخزن' میں سر عبدالقادر نے خود بھی لکھا اور دوسروں کو لکھنے پر آمادہ بھی
کیا۔ چنانچہ جو لوگ اس میں لکھتے رہے، انھوں نے رومانی نثر نگاری کے نئے

---

[1] انتخابِ مخزن، جلد سوم، ص ۲۔

تجربات کئے اور ان تجربات نے ان میں سے بیشتر کو صاحبِ طرزِ انشاء پرداز بنا دیا "مخزن" کے لکھنے والوں میں سر عبدالقادر کے ساتھ ساتھ سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوشؔ، مولوی عبدالحق، مرزا محمد سعید، آغا شاعر دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال وغیرہ کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے ہاں سرسید کی نثر کے رجحانات تو ملتے ہیں لیکن ایک رومانی انداز بھی ان کی نثر میں ایک نئے تجربے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کی نثر کے چند نمونے یہ ہیں :

"بہے جا، بہائے لئے جا، نہ تجھ میں سلامتی نہ تیرے کنارے میں سلامتی، مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا، تیراکوں کو ڈبا، غواصوں کو نہ ابھار، یہی تیرا کام ہے۔ تجھ میں جو خوشنما ہرے بھرے جزیرے نظر آتے ہیں، جو پھولوں اور پھلوں سے مالا مال ہیں، جن میں خوبصورت پرند چہچہا رہے ہیں، کیا یہی لذائذِ حیات ہیں؟ وہ حسین سحر کار عورتیں جو ہاتھ میں ستار لئے دل ربا گانے گا رہی ہیں اور جادو بھری نظریں ڈال ڈال کر مجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں، کیا یہی جوانی کی امنگیں ہیں؟ آہ! مجھے اس جزیرے کو دیکھنے دے۔ ان دلولوں سے، ان پریوں سے تو ملنے دے، ان کے گانے سے اپنے دل کو راحت تو پہونچا دے۔ مگر تو کس کی سنتا ہے؟ تو نے کسی اور تنکے کی سنی ہے جو میری سنے گا۔ اچھا لے! تجھے یہی قسم ہے! بہائے لئے جا، ذرا نہ ٹھہر۔ مگر یہ تو بتا دے، تو مجھے کہاں سے لا رہا ہے؟ کب سے لا رہا ہے؟ کیوں لا رہا ہے؟ کب تک بہائے گا؟" [1]

(سجاد حیدر یلدرم)

"اب پہاڑ، جنگل، بیابان اکیلے کھڑے ہیں اور شہروں کی رونق و چہل پہل کو ترستے ہیں۔ شہر رات دن کے غل و شور سے اکتا کر پہاڑوں اور صحراؤں کی خاموشی پر حسرت

[1] انتخابِ مخزن، حصہ دوم، ص ۴۴

کے آنسو بہاتے ہیں۔ دریا شاکی ہیں کہ ہم بہتے بہتے تھک گئے۔ یہ کنارہ آرام سے بیٹھا ہے۔ یہ کیوں نہیں بہتا۔ کنارہ کہتا ہے میں خود اپنی افتادگی سے نالا ہوں، نقلِ مکان کر نہیں سکتا ورنہ تمھاری طرح سیر کرتا پھرتا!" [۱] (حسن نظامی)

"ذرا آنکھ کھول کر دیکھو! کیا بہار ہے، نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے۔ بادِ صبا کی اٹکھیلیاں، چلتے ہوئے پانی، بہتی ہوئی ندیاں، شفاف جھیلیں۔ ذخار سمندر، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ اور ان کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں، پھولوں کے تختے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں، درخت اور ان کے ہرے ہرے پتّے، سبزہ اور اس کا فرشِ زمرد، پکتے ہوئے کھیت اور ان میں قوت سے بھرے ہوئے سنہری خوشے نگاہ کے لئے جنت تو کیا ہے۔ بلبل اور اس کی خوشنوائی، فاختہ اور اس کی کوکو، کوئل اور اس کی کوک، پپیہا اور اس کی پی، یہ نغمہ نہیں تو کیا ہے؟ اسی کو تو فردوسِ گوش کہتے ہیں۔" [۲] (سر عبد القادر)

"ایک بات جو خصوصاً اس واقعہ کے متعلق قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ شیلے کا دل شعلوں کی دست برد سے محفوظ رہا اور راکھ میں سے صحیح و سالم نکالا گیا۔ آہ! آگ کے بے رحم شعلے بھی شاعر کے نازک دل کی قدر کرتے ہیں لیکن اے موت! تیرا تیر کسی کو نہیں چھوڑتا۔" [۳] (مرزا محمد سعید)

ان چند اقتباسات سے 'مخزن' کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے اندازِ نثر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس زمانے کے بیشتر لکھنے والوں کا کم و بیش یہی انداز ہے علمی، ادبی اور تنقیدی موضوعات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ جگہ جگہ اسی قسم کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس انداز میں تخیل اور جذبے کی فراوانی ہے اور اسی میں اس نے ایک شاعرانہ

---

[۱] انتخابِ مخزن، حصہ دوم، ص ۹۱۔
[۲] انتخابِ مخزن، حصہ اول، ص ۶۔
[۳] انتخابِ مخزن، حصہ اول، ص ۷۵۔

رنگ و آہنگ پیدا کر دیا ہے جو دماغ کے ساتھ دل پر بھی اثر کرتا ہے اور اس طرح اس کے ہاتھوں احساسِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔

سر عبدالقادر نے قدیم و جدید اور بناوٹ و تکلف کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے نثر پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ نہایت خیال انگیز ہے، اور ان کے عہد کی نثر میں روایت اور تجربے کی کیفیت ان کے بیان سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نثر میں بھی آج سے بیس پچیس برس پہلے تک یہی رنگ (یعنی بناوٹ اور تکلف) ہے۔ عبارتیں مقفیٰ، الفاظ زیادہ، خیالات کم، خطوط میں القاب لمبے اور مطالب مختصر، ضرورت سے زیادہ مبالغہ، ضرورت سے زیادہ لجاجت۔ رقعات کے رنگ کو تو پہلے مرزا اسداللہ خاں غالب نے پلٹا اور اردو نثر کی سادگی میں وہ پرکاری دکھائی کہ آج تک اس کا کسی سے جواب نہیں ہو سکا۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ مرزا غالب بجائے انیسویں صدی کی ابتدا کے اس کے وسط میں پیدا ہوتے اور اس وقت زندہ ہوتے تو نئے زمانے کی ہوا سے ان کی طبیعت وہ جلوہ دکھاتی کہ اردو نظم مطالب اور معانی کی بلندی کے اعتبار سے ہر زبان کی عمدہ نظم سے مقابلہ کر سکتی، اور نثر میں وہ جادو ہوتا جسے طبیعتیں آج کل ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں۔ تاہم جس زمانے میں مرزا غالب ہوئے اس کے اعتبار سے جو کچھ وہ نثر کی تجدید میں کر گئے، نہایت حیرت خیز ہے۔ اس کے بعد سر سید احمد خاں مرحوم نے اردو نثر میں انگلستان کے سلیس سے سلیس لکھنے والوں کا نقشہ دکھایا۔ اور اس نے سب سے پہلے یہ دکھایا کہ کلام بغیر رنگینی کی کوشش کے مؤثر اور پر زور ہو سکتا ہے، اور زبانِ اردو باوجود اپنی نو عمری کے ایسے ایسے دقیق مطالب کے ادا کرنے کی متحمل ہے جو کئی اور زبانیں باوجود پیرانہ سالی کی مشق کے نہیں ادا کر سکتیں۔ سر سید مرحوم کا یہ شوق رفتہ رفتہ ان کے احباب تک پہونچا۔ اور بہت سے اصحاب

سادہ مگر پرمطلب مضامین لکھنے والے ملک میں پیدا ہو گئے۔ نظم میں سادگی، سب سے پہلے اختیار کرنے کے ثواب کے مستحق مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ اور اب شعر میں سادگی، اصلیت اور جوش دکھانے والے شعرا ہندوستان میں موجود ہوتے جاتے ہیں۔ ہم آج سادگی کی اصلی دلفریبیوں کے قدردانوں کو صلائے عام دیتے ہیں کہ اگر سادگی اور بناوٹ کی جنگ دیکھنی ہو تو ہمارے پاس آئیں اور 'مخزن' کے صفحوں میں دیکھیں۔ بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور ہو سکتا ہے، اس کو اپنے دلدادوں کی تعداد کا گھمنڈ ہے اور بجا ہے۔ مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اور درست ہے۔ اور سب سے بڑی تسلی اسے یہ ہے کہ زمانے کی رفتار اس کے موافق ہے۔" ؎۱

سر عبدالقادر کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو نظم اور نثر دونوں کے مزاج داں تھے، اور جو تبدیلی وہ مجموعی طور پر اس وقت کے ادب میں، اور خصوصاً نثر میں لا رہے تھے، وہ ان کے نزدیک وقت کا تقاضا تھی۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس تبدیلی کا آغاز "تہذیب الاخلاق" اور اس کے پڑھنے والوں سے ہوا لیکن اب 'مخزن' نے لوگوں کے لئے ادب کے ذریعے "تفریحی سامان" پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ "مخزن" کے لکھنے والوں کی مختلف تحریروں سے ظاہر ہے، وہ معنوی اعتبار سے وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں، اور ساتھ ہی اپنے رنگین اور پرکار اسلوب سے تفریح کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں کیونکہ اس میں حسن و جمال کا رنگ و آہنگ، ذوقِ حسن اور احساسِ جمال کی تسکین کا باعث بھی بنتا ہے۔

"مخزن" اور اس کے لکھنے والوں نے اردو نثر کو اسی صورتِ حالی سے آشنا کیا جس کے نتیجے میں اردو نثر کی روایت کو ایک ایسا رنگ و آہنگ ملا جس سے وہ اس سے

؎۱ انتخابِ مخزن، حصہ سوم، ص ۴-۵

ایس نا آشنا تھی۔

۴

اس میں شبہ نہیں کہ یہ انداز اور آہنگ ہلکے پھلکے موضوعات کی ترجمانی کے لئے مستعمال کیا گیا لیکن اس کے اثرات علمی موضوعات کے اظہار و ابلاغ میں بھی اپنی جھلکیاں دکھانے لگے۔ خود سر عبدالقادر کے علمی اور تنقیدی مضامین میں اس انداز کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن اس عہد میں اس کے اثرات، تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ مولانا ابو الکلام آزاد، مہدی حسن افادی الاقتصادی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ یہ سب کے سب عالم تھے۔ ان کا میدان صحافت اور سیاست تھا، لیکن کسی کو تاریخ، تہذیب اور معاشرے سے دلچسپی تھی، کوئی دین اور مذہب کا شیدائی تھا اور اسی کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرنا اس کے پیش نظر تھا، کسی کو زبان اور لسانی معاملات اور حقائق کو سامنے لانے کی دھن تھی، اور اس نے اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا لیکن ایک بات ان سب میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ وہ سب کے سب اردو نثر کی روایت کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے کیونکہ انھوں نے موضوع کی مناسبت سے رنگین اور پرکار اسلوب کی تخلیق کی ہے۔ کسی نے الفاظ کی پرشکوہ کیفیت سے، کسی نے زبان کے صحیح اور مناسب استعمال سے اور کسی نے سادہ پرکاری سے اپنے اسلوب کی عمارت کو تعمیر کیا ہے۔ ان سب کے اسالیب میں ایک رس اور رعنائی ہے اور وہ دلوں میں اترنے اور اعصاب پر چھانے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد تحریکِ 'مخزن' یا عہد اقبال کے سب سے زیادہ جان دار

انشا پرداز ہیں۔ انھوں نے جوش اور جذبے سے کام لے کر اردو نثر کو جو شاندار اور پرشکوہ اسلوب دیا ہے، اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک عالم دین اور صحافی تھے لیکن ان کے اندر ایک شاعر کا دل بھی تھا۔ ان کی شخصیت میں شاہانِ وقت کی سی پرشکوہ کیفیت تھی۔ ان کے خیالات و نظریات میں انقلابیوں کی سی صلابت تھی۔ اسی لئے وہ اپنے صحافتی اور علمی مضامین و مقالات میں بھی ایسے اسلوب کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے جس میں جذبے کی شدت اور تخیل کی بلندی سے پیدا ہونے والی رنگین اور پرکار کیفیت کے ساتھ ایک پرشکوہ بلند آہنگی سب سے نمایاں ہوتی ہے۔ صرف ایک اقتباس مولانا آزاد کے اسلوبِ نثر کی روح سے آشنا ہونے کے لئے کافی ہے۔ عراق کا ذکر کرتے ہوئے، اور اس کی زبوں حالی پر آنسو بہاتے ہوئے، مولانا آزاد لکھتے ہیں :

"لیکن اے سرزمینِ عراق! اے بہشت زارِ دجلہ و فرات! اے مصداقِ تجری من تحتھا الانہار! اے مایۂ عشقِ چہل کرور نفوس ملت! قیسِ عامری کی لیلیٰ چند دنوں کے لئے تیری آبادیوں میں آ بسی تھی اور تمام سرزمین یکسر لیلیٰ زارِ حسن و جمال ہے اور تیری کسی ایک عمارت کے اندر ہی نہیں بلکہ تیری خاک کے ہر ذرّے کے اندر ہمارے عشقِ ماضی کا ایک جلوۂ حسن و جمال آراستہ ہے۔ قیسِ عامری کی لیلیٰ اگر بادیۂ نجد کے خیموں سے نکل کر تیری سرزمین میں آ گئی تھی تو ہمارے اقبال رفتہ کی بھی ایک لیلیٰ ہے جو ریگ زارِ حجاز سے نکلی اور صدیوں تک تیری سرزمین اس کے لئے منزلِ عیش و نشاط رہی۔ بابل و نینوا کی وراثت تیری ہی سرزمین میں ہم کو دی گئی تھی۔ کلدان اور مدائن کے مدفون خزانے تو نے ہی ہمارے سپرد کئے تھے۔ ہارون الرشید کی سنہری کشتیاں تیرے ہی دجلے میں تیرتی تھیں۔ مامون اعظم کا دربارِ عظمت و اجلال

تیری ہی خاک کا ایک افسانۂ گذشتہ ہے۔ تو ہی ہے کہ تیسری ہی زمین کا ایک ایک کھنڈر، تیری خاک کا ایک ایک تودہ، تیری نہروں کی ایک ایک لہر کاروانِ رفتہ لیلیٰ کا قدم اور ہر کاروبارِ عشقِ ماضی کا افسانہ سرا ہے۔ اور پھر اے سرزمین لیلیٰ! تیری ہی فضائے محبوب ہے جس کے ہر ذرے سے آج بھی بازگشت ناقۂ لیلیٰ کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اور ہر اس مجنوں کے لئے ملامت ہے جو عشق لیلیٰ کے دعوے کے ساتھ سرزمین لیلیٰ سے تغافل بھی کر رہا ہے۔ حالانکہ عشق لیلیٰ کا دعویٰ اور مسکن الٰہی سے غفلت یہ دونوں چیزیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔" [1]

اس میں عراق کا ذکر حد درجہ جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کا محرک عراق کا حال زبوں اور سیاسی اعتبار سے اس کی پامالی کا احساس ہے لیکن مولانا آزاد نے اس کو اس شدت سے محسوس کیا ہے کہ اس کی عظمت رفتہ کے نشیب و فراز کی تصویریں ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہیں۔ انھوں نے پرشکوہ الفاظ، نادر تشبیہات و استعارات، بلیغ اشارات وکنایات اور حد درجہ رواں دواں انداز و اسلوب سے اس کو مجموعی طور پر ایک ایسے اچھوتے، نئے، رنگین اور پرکار انداز نثر کی صورت دے دی ہے جس کا اردو نثر کی روایت نے اس سے قبل کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس انداز نثر کے پس منظر میں مولانا کا سیاسی شعور، اسلام اور اس کی عظمت رفتہ سے ان کی دلچسپی، آزادی کی جد و جہد سے ان کا شغف، مسلمانوں کی زبوں حالی سے ان کی دل گرفتگی، ان کے سوچنے کا مخصوص انداز، ان کی شخصیت کی پہلو دار کیفیت اور ان کے علاوہ نہ جانے اور کتنی ہی باتوں کا لہو ہے۔ اس لہو نے اس اسلوب نثر کو ایک نئی زندگی اور جولانی سے ہم کنار کیا ہے۔ "تذکرہ" سے لے کر

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد: مضامین ابوالکلام (دارالاشاعت کراچی) ص ۱۲۹۔

'الہلال' اور 'البلاغ' کے تاریخی، سیاسی اور دینی مضامین بلکہ 'غبارِ خاطر' تک مولانا ابو الکلام آزاد کے اسلوبِ نثر میں یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی اس رومانیت پسندی کے اثرات ہیں جو 'مخزن' کی تحریک میں نمایاں تھے۔ اس میں بھی جذبے کی شدت اور تخیل کی بلندی اور اور بلند پروازی نمایاں ہے جس نے اس کو ایک پرشکوہ، رنگین اور پرکار اندازِ بیان بنا دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ 'تذکرہ' کے اسلوب کے مقابلے میں 'غبارِ خاطر' میں نسبتاً زیادہ ترفع اور زیادہ ترشی ہوئی کیفیت ہے اور اس کا سبب ابو الکلام کے اسلوبِ نثر کا ارتقائی مزاج ہے۔

بہر حال مولانا ابو الکلام آزاد نے اردو نثر کی روایت کو ایک نئے تجربے سے آشنا کیا اور ایک ایسے اسلوبِ نثر کی داغ بیل ڈالی جو اُردو نثر کے لئے بالکل نیا تھا۔ اس اسلوب نے اُردو نثر کو نئی زندگی عطا کی۔ اس میں جوشں اور ولولے کی بجلیاں بھریں اور بلند آہنگی نے اس کو آسمانوں پہ پرواز کرنا سکھا دیا۔

کم و بیش اسی زمانے رومانی انداز نثر کے ایک اور علمبردار ہمیں مہدی افادی نظر آتے ہیں۔ مولانا ابو الکلام نے جو رنگین اور پرکار انداز علمی، تاریخی، سیاسی اور دینی موضوعات کو پیش کرنے کے لئے استعمال کیا، اسی رنگین اور پرکار انداز سے مہدی افادی نے انسانی زندگی کے عام معاملات و مسائل کی ترجمانی کی۔ انسانی زندگی میں جذباتی اور جمالیاتی معاملات کا احساس و شعور ان کے ہاں بہت گہرا ہے۔ اس صورت حال نے ان کے اسلوبِ نثر میں بھی جذبے کی شدت اور تخیل کی بلند پروازی پیدا کر دی جس نے رنگینی اور رعنائی سے بھرپور فضا کو قائم کیا۔ وہ بغیر اس فضا کے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ ان کے یہاں اظہار لطیف اشاروں اور کنایوں میں ہوتا ہے۔ ابلاغ کے لئے وہ رنگین تشبیہات و استعارات سے کام لیتے ہیں۔ ان کا اسلوب زندگی سے بھرپور ہے۔ اس میں بڑی ہی جولانی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس میں طرح داری کا احساس بھی ہوتا

ہے اور یہ سب باتیں مل کر ان کے اسلوب کو رومانی نثر کا مرقع بنا دیتی ہیں، جس میں سے زندگی کے ابلنے کا احساس ہوتا ہے۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے صحیح لکھا ہے کہ اردو نثر کی تاریخ میں میر امن کے بعد شبلی تک مجھے سوائے آزاد کے کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جس کے صرف اسلوب میں اتنی زندگی ہو جتنی افادی الاقتصادی کے اسلوب میں ہے اور جو محض اپنے اسلوب کی بنا پر تاریخ ادب میں ایسی مستقل حیثیت کا مالک اور ایسی پائیدار زندگی کا مستحق ہو۔ شبلی کے اسلوب کو موضوع کی اہمیت اور وقعت سے الگ کر لیجیے تو اس میں کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ ان کا اسلوب اپنے تمام تناسب اور آہنگ کے باوجود فاضلانہ طرز تحریر سے سرمو آگے نہیں بڑھتا۔ حالی کا انداز تحریر سلیس، بے تکلف، پختہ اور نرم ہے مگر اس کے اندر کوئی خالص جمالیاتی کیفیت بہت کم ہے۔ نذیر احمد کے اسلوب میں ایک البیلاپن ہوتا ہے جو صرف کسی افسانہ نگار کو زیب دے سکتا ہے۔ افادی الاقتصادی کے اسلوب کی اہمیت موضوع کی اہمیت سے الگ چیز ہے اور بڑے مرتبے کی چیز ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت جمالیت ہے۔ ان کے اندر ایک خداداد ذوق جمال تھا جو ان کی تحریروں میں بھی اسی طرح نمایاں اور محسوس ہوتا تھا جس طرح کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں۔ خود شبلی ان کے معتقد ہیں اور یہ اعتراف محض زبانی یا رسمی نہیں ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے۔ دائرۂ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو، یقین کی بات نہیں۔" [۵]

شبلی نے مہدی افادی کے اسلوب کو نذیر احمد اور آزاد کے اسلوب کا امتزاج تصور کیا ہے اور لکھا ہے کہ نذیر احمد اور آزاد کی دو روحوں نے (مہدی

---

۵ پروفیسر مجنوں گورکھپوری: نقوش و افکار، ص ۴۱-۴۲

کے اسلوب میں) ایک قالب اختیار کیا ہے۔ مجنوں صاحب نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور لکھا ہے کہ:

"شبلی کی نظر نذیر احمد اور آزاد سے باہر نہ جا سکی۔ ان کو یہ احساس نہ ہو سکا۔ اور کیسے ہوتا، کہ دراصل والٹر پیٹر، رسکن اور آسکر وائلڈ کی مردہ روحوں نے ہندوستان میں آکر ایک اردو انشا پرداز کا جنم لیا ہے۔ مجھے اردو نثر نگاروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو افادی الاقتصادی کا ہم زبان قرار دیا جائے اور جس کے اسلوب سے ان کے اسلوب کا موازنہ کیا جائے۔"[۱]

مجنوں صاحب کے اس بیان میں تھوڑا سا مبالغہ ضرور ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مہدی افادی نے رنگین اور شاعرانہ، حسن و جمال سے لبریز اسلوب نثر لکھنے کا ایک نیا اور اچھوتا انداز پیدا کیا ہے جس کو بقول مجنوں صاحب انشائے لطیف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ چند اقتباسات اس خیال کو صحیح ثابت کرتے ہیں:

"مہرالنساء جوان بیوہ کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے، لیکن ہائے وہ حسنِ افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو۔ خوب جانتی تھی کہ بجلی کدھر گرے گی۔ جہانگیر ایک روز اس کے کمرے میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے شیش محل ہو رہا تھا۔ حوروش کنیزوں کے حلقے میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے۔ فطرت کی لاڈلی ہمہ غمزہ، ہمہ عشوہ، ہمہ ناز، نہایت سادے سفید باریک لباس میں تھی لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔ مقیاس الشباب کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چھپی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اودی رگوں سے پیچ و خم اور ابھار کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے۔ اس پردہ کافوری برہنہ افقی! خیال

---

[۱] پروفیسر مجنوں گورکھپوری: نقوش و افکار، ص ۴۲

کے لئے کیا باقی رہا۔"

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز یعنی کل کی چھوکری کو، جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں، یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جو اینوں پر آئی ہوئی بجلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعرا سے گاڑھا اتحاد رہا۔ یہ اقتضائے سن بُری طرح کھل کھیلی۔ ہاتھ پاؤں نکالے اور بہیترے بنائے بگاڑے، کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو کر رہ گئے، اور بال بال بچی۔ آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول نویس تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ لیکن دفعتاً اس کی حالت نے پلٹا کھایا۔ کثرتِ فواحش باعث سنجیدگی ہو گئی۔ اچھے دن ہوتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے اور قریب قریب انھیں کے تصرف میں ہے۔"

یہ دونوں اقتباسات موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک کا موضوع حسین وجمیل عورت کے حسن وجمال کی مصوری ہے جو براہ راست حواس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دوسرے کا موضوع اردو زبان کا آغاز وارتقا ہے لیکن اس لسانی اور تنقیدی موضوع میں بھی انھوں نے وہ رسیلا انداز پیدا کر دیا ہے جو ان کے اسلوبِ نثر کی جان ہے اور جس کو رومانی نثر کی روایت کا کمال سمجھنا چاہیئے۔ اس میں ابوالکلام کی نثر کی سی بلند آہنگی نہیں ہے۔ لیکن وہ رچاؤ اور رنگینی موجود ہے جو حواس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مہدی حسن افادی اس اعتبار سے بیسویں صدی کی اردو نثر میں ایک منفرد

حیثیت رکھتے ہیں۔

اس انداز فکر کا اثر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی نثر پر بہت گہرا ہوا۔ آگے چل کر اسی اثر سے اردو میں ادب لطیف اور انشائے لطیف کی تحریک چلی اور اسی انداز نثر نے نیاز فتحپوری، سجاد انصاری، لطیف الدین احمد، قاضی عبدالغفار، پروفیسر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، مولانا صلاح الدین احمد، باری علیگ اور چودھری افضل حق وغیرہ کی رومانی نثر کو پیدا کیا۔

۵

اردو نثر کی روایت میں اس رومانی انداز کے ساتھ ساتھ نثر کا ایک ایسا انداز بھی فروغ پا رہا تھا جس میں رومان و حقیقت کے رنگوں کا ایک حسین امتزاج تھا۔ اس انداز نثر کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا متوازن انداز ہے۔ اس انداز میں رومان اور حقیقت آپس میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس میں نہ تو رومانی انداز نثر کی رنگینی اور پرکاری غالب ہے اور نہ افادی انداز نثر کی صرف بیانیہ کیفیت نمایاں ہے۔ برخلاف اس کے اس میں افادی باتیں رومانی انداز میں اور رومانی باتیں افادی انداز میں کہی گئی ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس برسوں میں اس انداز کے نمایاں علمبردار ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ ہیں۔ ان کے اسالیب نثر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن بعض باتیں ان میں مشترک ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سب کے سب عالم ہیں اور اکثر علمی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا خاص موضوع زبان و لسان، ادب و شعر، تہذیب و ثقافت اور تحقیق و تنقید ہے۔ کچھ خاکے بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ مولانا سید سلیمان

ندوی کی نثر کے موضوعات تاریخ، دین وتہذیب اور لسانی وادبی معاملات ومسائل ہیں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے موضوعات فلسفہ، نفسیات، معاشرتی معاملات، تہذیبی مسائل، ادب وتنقید اور دین ومذہب ہیں۔ ان موضوعات کو پیش کرتے ہوئے ان لکھنے والوں نے آسان، سادہ اور رواں نثر سے کام لیا ہے، لیکن کہیں کہیں ایک خاص طرح کی پرکاری بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش شعوری نہیں ہے بلکہ ان کے مزاجوں کی شگفتگی اور طبیعتوں کی پہلودار کیفیت کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنے علمی رکھ رکھاؤ کے باوجود ایک شگفتہ مزاج کے مالک تھے۔ باقاعدگی ان کی شخصیت کی شاید سب سے اہم خصوصیت تھی۔ وہ سادگی کے قائل تھے لیکن ایک طرح کی طرح داری بھی ان کی شخصیت میں نمایاں تھی۔ وہ دھن کے پکے تھے۔ انھیں کام کی لگن تھی۔ وہ محنت اور جانفشانی سے کام کرنے کے قائل تھے لیکن ان سب باتوں نے ان کے مزاج کی شگفتگی کو مجروح نہیں کیا۔ چنانچہ ان کے اسلوبِ نثر میں سادگی اور روانی کے ساتھ ہی طرح داری اور شگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان پر سرسید کے اثرات بڑے گہرے ہیں لیکن سرسید نے اردو کو جو اسلوب نثر دیا، اس میں افادی پہلو بہت نمایاں تھا۔ اسی لئے اس میں سادگی کی حدیں سنجیدگی بلکہ خشکی سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق نے اس سادگی کو خشکی کے بجائے صفائی اور سلاست کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اور ایک ایسے پاکیزہ اور مصفا اسلوب کی داغ بیل ڈالی ہے جو سادہ ہونے کے باوجود اپنی ایک دلکشی رکھتا ہے۔ اس میں سلاست کے باوجود ایک بانکپن کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ایک پرشور آہنگ کی بجائے ایک پرسکون کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہیجانی کیفیت اس میں نام کو بھی نہیں ہے۔ البتہ ایک طرح کی بے باکی اور استواری کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ وہ نثر میں شاعری نہیں کرسکے ہیں لیکن جگہ جگہ انھوں نے اپنے اسلوب میں اپنے خاص لہجے سے ایک دلکشی کی

فضا ضرور پیدا کر دی ہے۔ زبان، محاورے، ضرب الامثال، روزمرہ اور الفاظ کے استعمال کو انھوں نے ایک فن بنا دیا ہے۔

مندرجہ ذیل چند اقتباسات سے ان کے اسلوبِ نثر کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے:

"ماضی سے گذر کر ہمیں حال کی طرف دیکھنا چاہیئے کہ اس پچیس تیس سال میں ہماری زبان کا رخ کس جانب ہے۔ دور کے ڈھول سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات دور کی بھونڈی چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ انسان کسی قدر قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ گذشتہ میں اسے بہت خوبیاں نظر آتی ہیں جو قریب ہونے کی وجہ سے حال میں نہیں دکھائی دیتیں۔ لیکن حال سے غفلت کرنا اپنے مستقبل سے غفلت کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم میں اس وقت سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی جیسے انقلاب انگیز مصنف نہیں ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں غریب مزدوروں میں سے، جو قصرِ ادب کے لئے اینٹ چونا تیار کرتے ہیں، ویسے ہی یا ان سے بڑھ کر معمار پیدا نہیں ہوں گے؟ اور یہ کیا ضرور ہے کہ حال کی رفتار اسی کینڈے کی ہو جو پہلے تھی۔ ادب صناعی ہے۔ صناعی میں (یہ خلاف فطرت) اعادہ محال ہے۔ کسی شاعر میں کتنا ہی سوز و گداز کیوں نہ ہو، میر نہیں ہو سکتا۔ کوئی کیسا ہی بلند فکر کیوں نہ ہو، غالب ہونا ممکن نہیں۔ بعد کے ادیب کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو اگلوں کی راہ پر چلے، جس میں سرسبز ہونا دشوار ہے، یا اپنے لئے نئی راہ نکالے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی راہ ہمیشہ صاف اور سیدھی نہیں ہوتی۔ اس میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کے جانچنے کے لئے ہر کونے کھدرے پر نظر دوڑانی چاہیئے۔"[1]

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق: خطبات عبدالحق، ص ۱۴۰-۱۴۱۔

"یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیت کے شعراء کو لیجئے؟ شاعری ان کی رگ و پے میں پیری ہوئی تھی۔ معمولی سا معمولی اور جزوی سا جزوی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا اور تحریک شعر کے لئے کافی تھا۔ ان کی لڑائیاں، ان کی فتح و شکست، عشق و محبت (خیالی ہنسی) خوف و خطر، انتقام، مہمان نوازی وغیرہ، یہاں تک کہ ایک بھیڑیے کی ولادت تک کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے۔ ان کے کلام میں تازگی، آزادی، مردانہ پن اور ذوقِ زندگی پایا جاتا ہے۔ اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس زمانے کی معاشرت، رسم و رواج اور خیالات و توہمات کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ گذشتہ تیس سال میں ہماری زندگی میں بہت کچھ تغیر واقع ہوا ہے۔ اگر دو ایک شاعروں سے قطع نظر کیا جائے تو کیا ہمارے شعرا کے کلام میں کہیں بھی انقلاب کا پتہ ہے؟ ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذ الرحمٰن ہیں۔ انھیں مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر انھیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں تو انھیں اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر اترنا پڑے گا۔" [1]

"اے صاحبو! میں نے لڑکپن میں انجمن حمایت الاسلام کا بچپن دیکھا تھا، اور اب بڑھاپے میں اس کی جوانی کی بہار دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں بڑھتا جاتا ہوں، بڈھا ہوتا جاتا ہوں۔ یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، جوان ہوتی جاتی ہے اور اے اہلِ پنجاب! جب تک آپ کی ہمت جوان ہے، اس کی جوانی کبھی نہ ڈھلنے پائے گی۔ اس کی ابتدا کا خیال کیجئے تو ایک نازک پودے سے زیادہ نہ تھی

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق: خطبات عبدالحق، ص ۲۹۔۴۰۔

جس کی نشوونما کے لئے ہوا کا ایک جھونکا کافی تھا لیکن آج یہ ہری بھری لہلہاتی کھیتی نظر آتی ہے۔ یہ آپ کے استقلال اور ایثار کی بے نظیر مثال ہے۔ یہ انجمن آپ کی سرزمین پر ابرِ رحمت کی طرح چھائی ہوئی ہے"۔[1]

(خطبۂ صدارت انجمن حمایت اسلام لاہور، ۱۹۳۶ء)

مولوی صاحب کے اس اسلوبِ نثر میں سادگی کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن سادگی کے ساتھ اس میں روانی ہے۔ اور کہیں کہیں اس میں ایسی تصویریں بھی ابھرتی ہیں جو ان کے خیالات و نظریات کو مؤثر طور پر ظاہر کرتی ہیں، لیکن ساتھ ہی دامنِ دل کو بھی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ مثلاً پہلے اقتباس میں مزدور، قصر ادب، اینٹ چونا، معمار، راہ نکلنا، سرسبز ہونا، پیچ و خم اور کونے کھدرے وغیرہ کی تصویریں ابلاغ کے ساتھ ساتھ حواس پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے اقتباس میں یہ تصویریں کہ "شاعری ان کے رگ و پے میں بھری ہوئی تھی" یا پھر "آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے" یا "اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر اترنا پڑے گا" اظہارِ مطلب کے ساتھ ساتھ طبیعتوں کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ اور تیسرے اقتباس میں تو اچھا خاصا شاعرانہ انداز جھلکتا ہے۔ انجمن حمایت اسلام کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی تصویروں کی تخلیق اور پھر اس کی کارکردگی کو ذہن نشین کرانے کے لئے ہوا کے جھونکے، ہری بھری لہلہاتی کھیتی اور ابرِ رحمت کی تصویروں کی ابھری ہوئی کیفیت مولوی صاحب کے اسلوبِ نثر کی پرکاری اور شاعرانہ مزاجی کو ظاہر کرتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مولوی صاحب کے اسلوب میں سرسید اور حالی کے اسلوبِ نثر کے اثرات موجود ہیں لیکن اس میں "مخزن" کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی نثر کے اثرات

---

[1] خطباتِ عبدالحق، ص ۳۴۔

بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنے اسلوب میں ان دونوں رجحانات کا ایک سنگم بنایا ہے اور اب دونوں کے درمیان ایک نہایت متوازن کیفیت پیدا کر کے اس کو دلنشیں بنا دیا ہے۔ شاعرانہ مزاج اس میں ہے لیکن شاعری اس میں نثر پہ غالب نظر نہیں آتی، اس کو نثر ہی رہنے دیتی ہے، اور یہی اس اسلوب نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔

مولوی عبدالحق، سرسید اور حالی سے زیادہ متاثر تھے۔ اس کے برخلاف ان کے ہم عصر نثر نگاروں میں مولانا سید سلیمان ندوی پر مولانا شبلی کا اثر نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ سید سلیمان ندوی ایک عالم دین تھے، لیکن جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اس میں ان کے اسلوب کی انفرادیت پوری طرح اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں سادگی ہے جس کی روایت سرسید سے ہوتی ہوئی شبلی کے توسط سے ان تک پہونچتی ہے۔ شبلی کے یہاں جو رومانیت تھی، اور اس کی وجہ سے ان کی نثر میں رنگینی اور رعنائی کی جو فضا جگہ جگہ ملتی ہے، وہ تو سید سلیمان ندوی کے ہاں نہیں ہے، البتہ انھوں نے سادگی اور روانی سے اپنی نثر میں وہ حسن پیدا کیا ہے جو طبیعت کو متاثر کرتا ہے لیکن ان کی یہ سادگی اور روانی مولوی عبدالحق کے اسلوب کی سادگی اور روانی سے مختلف ہے۔ اس میں جگہ جگہ شبلی کی پرکاری کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور سید سلیمان ندوی کی نثر کے یہ مقامات ایسے ہیں جو ان کے یہاں کہیں کہیں رومانی اسلوبِ نثر کی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ بہر حال ان کے ہاں بھی رومان اور حقیقت کا ایک امتزاج ہے جو اظہار و ابلاغ میں معاون ہوتا ہے اور ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بھی بنتا ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھیں اس میں یہ صورتِ حال ضرور نظر آتی ہے۔ "خطباتِ مدراس" سب میں یہی اندازِ تحریر نمایاں ہے۔

یہ چند اقتباسات ان کے اسلوب نثر کی انھیں خصوصیات کی آئینہ داری

کرتے ہیں :

"دنیا کا یہ طلسمی کارخانہ رنگا رنگ عجائبات سے معمور ہے۔ قسم قسم کی مخلوقات ہیں۔ ہر مخلوق کی علیحدہ علیحدہ صفتیں اور خاصیتیں ہیں۔ جمادات سے لے کر نباتات تک اگر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ بتدریج اور آہستہ آہستہ ان میں احساس، ادراک اور ارادہ کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ جمادات کی ابتدائی قسم مثلاً ذرات (ایٹمز) یا ایتھر ہر قسم کے احساس، ادراک اور ارادہ سے خالی ہے۔ جمادات کے اور اقسام میں ایک طرح کی زندگی کا ہلکا سا نشان ملتا ہے۔ نباتات میں احساس کی ایک غیر ارادی کیفیت نشو و نما کی صورت میں جلوہ گر معلوم ہوتی ہے۔ حیوانات میں احساس کے ساتھ ارادے کی حرکت بھی ہے۔ انسان میں احساس، ادراک اور ارادہ پورے کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہی احساس، ادراک اور ارادہ ہماری تمام ترذمہ داریوں کا اصلی سبب ہے۔ مخلوق کی جس صنف میں، جس حد تک، یہ چیزیں کم ہیں، اسی حد تک وہ ارادی فرائض کی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔ جمادات سرے سے ہر قسم کے فرائض سے محروم ہیں۔ نباتات میں زندگی اور موت کے کچھ فرائض پیدا ہو جاتے ہیں۔ حیوانات میں کچھ اور فرائض بڑھ جاتے ہیں۔ انسان کو دیکھئے تو وہ فرائض کی پابندیوں سے سراسر جکڑا ہوا ہے۔ پھر انسان کے مختلف افراد پر نظر ڈالئے تو مجنوں، پاگل، بیوقوف، بچے ایک طرف اور عاقل، بالغ، دانا، ہشیار، عالم دوسری طرف، اسی احساس، ادراک اور ارادہ کی کمی بیشی کے لحاظ سے اپنے اپنے فرائض کچھ کم نہیں رکھتے، یا کم رکھتے ہیں یا بہت زیادہ رکھتے ہیں۔" [1] (خطبات مدراس)

---

[1]۔ مولانا سید سلیمان ندوی : خطبات مدراس، ص ۳۔۴

"ان لوگوں میں بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالار ہیں جنھوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے طبقے الٹ دئیے ہیں۔ لیکن کیا انسانیت کی فلاح و ہدایت کے لئے انھوں نے کوئی نمونہ چھوڑا؟ کیا ان کی تلوار کی کاٹ میدانِ جنگ سے آگے بڑھ کر انسانی اوہام و خیالاتِ فاسدہ کی بیڑیوں کو بھی کاٹ سکی۔ انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی؟ انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کر سکی؟ ہماری روحانی مایوسیوں اور ناامیدیوں کا علاج بتا سکی؟ ہمارے دلوں کی ناپاکی اور زنگ کو مٹا سکی؟ ہمارے اخلاق اور اعمال کا کوئی نقشہ بنا سکی؟" [۱]

(خطباتِ مدراس)

عرب کے بادیہ نشیں جب فاتحانہ پرچم کے سائے میں عرب کے ریگستان سے باہر نکلے تو جس طرح ایران کا درفشِ کاویانی، چین کی دیوار، مصر کے اہرام، افریقہ کے صحارا اور اندلس کا دریا، ان کے سیاسی زور و قوت کو روکنے سے عاجز تھا، اسی طرح ان کی عربی زبان کے معنوی استیلا و اقتدار سے بھی بچاؤ ان کے لئے ناممکن تھا۔ ایران کی پہلوی، شام کی سریانی، مصر کی قبطی، افریقہ کی بربری اور اندلس کی اسپینی زبانیں دفعتاً پردۂ عالم سے گم ہو گئی تھیں۔ ایوانِ حکومت عرب سپہ سالاروں کے ماتحت تھے تو معبدوں اور کلیساؤں کی درس گاہیں عربوں کے ادبیات و علوم کی سرپرستی میں تھیں۔ سندھ کے کناروں سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور وہ قرآن کی زبان تھی۔" [۲]

---

[۱] مولانا سید سلیمان ندوی: خطباتِ مدارس، ص ۱۰۹۔

[۲] مولانا سید سلیمان ندوی: نقوشِ سلیمانی، ص ۳۔

"ہمارے ملک میں سات سمندر پار سے آکر جب اہل یورپ نے اپنے نئے علوم و فنون کی نمائش کی ہے تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا جب وہ عیش و مسرت کی شراب سے بدمست تھا۔ اس وقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دساور کی نئی چیزوں کی قدر کرے اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں، جس پر ان کو بڑا غرور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے۔ تاہم اس میخانے میں کچھ اہل ہوش بھی تھے۔ انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا اور جو چیزیں ان کے ہاں نہ تھیں وہ فرنگستان کی دوکان سے خرید لائے۔"[1]

یہ نہایت شگفتہ اور شاداب نثر ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع نام کو نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں جگہ جگہ ہلکی سی رنگینی کا احساس ہوتا ہے۔ جو رنگ اس میں بکھرے ہوئے ہیں، وہ زیادہ گہرے اور تیز نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے ان میں ہلکے رنگ کی سی کیفیت ہے۔ روانی اور باقاعدگی اس میں ویسی ہی ہے جیسی مولوی عبدالحق کی نثر میں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے ہاں رنگینی کے مقابلے میں سادگی اور بانکپن زیادہ ہے۔ سید سلیمان ندوی کے ہاں رنگینی شبلی کے اثر کا نتیجہ ہے لیکن اس میں وہ شدت نہیں جو شبلی کے ہاں پائی جاتی ہے۔ شبلی کے ہاں رومانیت غالب ہے، سید سلیمان ندوی کے ہاں رومانیت حقیقت کے نیچے دب گئی ہے۔ لیکن ان دونوں نے آپس میں مل کر ایک وحدت کی صورت ضرور اختیار کر لی ہے۔

مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی کے مقابلے میں مولانا عبدالماجد کے ہاں انشاء پردازی کا خیال نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور تھوڑے سے تصنع کا احساس ان کے ہاں ضرور ملتا ہے۔ لیکن ویسے مجموعی طور پر ان کی نثر کا انداز بھی سادہ و پرکار ہے۔ مولانا عبدالماجد فلسفی اور عالم دین ہیں اس لئے عالمانہ انداز کی خصوصیات بھی ان کے

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، ص ۸۰۔

ں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ لیکن یہ عالمانہ انداز ان کی نثر کو خشک اور بوجھل نہیں
نا تا۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاج کی شادابی ان کی علمی نثر میں بھی رنگ بھر دیتی
ہے۔ مولانا کی شخصیت، اس میں شبہ نہیں کہ، ثقاہت سے عبارت ہے لیکن لکھنوی
تہذیب کا چلبلاپن بھی ان کے مزاج کا جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظوں کے اُلٹ
پھیر سے وہ ہلکی سی مزاح کی چاشنی پیدا کرنے کا گر جانتے ہیں۔ ضلع جگت کو انھوں نے فن
بنا دیا ہے اور اس کے جسم میں نیا خون دوڑا دیا ہے۔

یہ نثر کتنی شگفتہ، کتنی شاداب اور کس درجہ رنگین اور پرکار ہے۔

"لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ جانِ عالم کا لکھنؤ، زمانہ یہی انیسویں صدی کے
وسط کا، آج سے کوئی ستر پچھتر سال قبل۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل
کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینے میں جوش تمنا؛ ہر شام میلوں ٹھیلوں کا
ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم، یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی
پریوں کا پترا۔ ادھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، ادھر گلے سے تانیں اور
ہاتھوں سے تالیاں۔ گلی گلی جنت نگاہ و فردوس گوش، چپہ چپہ دامانِ باغبان و
کفِ گل فروش۔ بڑے بڑے متین اور ثقہ گویوں اور سازندوں کی سنگت میں،
اچھے اچھے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کی صحبت میں۔ سفید پوشوں کے
دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لال لال، جبّے اور عمامے والے پیشوازوں کی
گردش پر نثار۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کی اصطلاح میں آرٹ اور فائن آرٹ
کا دور دورہ، عشق کا چرچا، حسن کا شہرہ۔ اس فضا میں ایک صاحب حکیم
تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں۔ کوئی عالم دین نہیں، صوفی درویش نہیں،
واعظ مصلح نہیں، چونچلوں کے آدمی، یار باش، رند مشرب، اہلِ بزم کے خوش
کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لے کر بیٹھے تو انگلیاں انھیں پردوں پر پڑیں جن کے

نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے، اور منہ سے بول نکالے تو وہی جن کے نقش دلوں میں سجے ہوئے تھے۔" ؎۱ (اُردو کا ایک بدنام شاعر)

"غرض کچھ وضع قدیم کا پاس، کچھ اپنے علمی وقار کا لحاظ، داستان سرائی کرنے بیٹھے تو چہرے پر مرزا رسوا کا نقاب ڈال لیا، حالانکہ یہ نقاب تھا اتنا باریک کہ جو چاہے وہ ایک ایک خط و خال، ایک ایک بال باہر سے گن لے۔ اُردو میں ناول بہتوں نے لکھے، اچھے اچھوں نے لکھے پر ان کا رنگ سب سے الگ، ان کا انداز سب سے جدا۔ نہ ان کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں، نہ ان کے بیان میں غرابت زائیاں، نہ ان کے اوراق میں برق پیمائیاں اور نہ کوہ تراشیاں۔ نہ ان کے الفاظ ترنم ریز، نہ ان کی ترکیبیں ارتعاش انگیز، نہ ان کی تصویر بزم میں برق پاشیاں، نہ ان کی داستانِ بزم میں ابتسام آرائیاں، پلاٹ وہی روزمرہ، صبح و شام کے بیتی آنے والے واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہیں۔ زبان وہی گھر اور باہر کی ستھری۔" ؎۲ (مرزا رسوا کے قصے)

"خیال ہوتا ہوگا کہ ان ناولوں میں نوجوانوں کے بھانے اور نو عمروں کے جذباتِ نفسانی کے بھڑکانے کا سامان افراط سے موجود ہوگا؛ لیکن تو یہ کیجئے۔ فحش و عریانی الگ رہی، رکاکت و ابتذال بھی کہیں آنے نہیں پایا۔ اور کہیں دو ایک جگہ جہاں مصوری اور سچی عکاسی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا، وہاں بھی انداز

؎۱ مولانا عبدالماجد دریابادی: مقالاتِ ماجد، ص ۱۴۵-۱۴۶۔
؎۲ مولانا عبدالماجد دریابادی: انشائے ماجد، ص ۱۰-۱۱۔

بیان زیادہ سے زیادہ لطیف اشارہ و کنایہ کا رکھا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں کوئی گندی نالی پڑ گئی ہے، اور آپ ہیں کہ رومال ناک سے لگائے، لپ جھپ لمبے لمبے ڈگ رکھتے اس سے گذرے چلے جا رہے ہیں۔ تقریباً ہر افسانہ شریف گھرانوں میں بار پانے کے قابل۔ پڑھتے جائیے اور حیاتِ بشری میں درک و بصیرت حاصل کرتے جائیے۔ آپ ادھر افسانے کی لذت میں محو رہیں گے اور ادھر عبرت و ہدایت کے گھونٹ بلا تکلف حلق سے اترتے چلے جائیں گے۔"[۱]   (مزدا رسوا کے قصے)

انشاء پردازی ان اقتباسات کے ایک ایک لفظ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ان میں پختگی اور روانی کے ساتھ رنگین کاری کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ایک پہلو دار کیفیت نظر آتی ہے، ایک طرح کا رچاؤ دکھائی دیتا ہے اور یہی تمام پہلو مل کر مولانا عبدالماجد کے اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں۔ ادب اور تنقید کے علاوہ مولانا عبدالماجد کا ایک میدان فلسفہ بھی ہے۔ فلسفیانہ مضامین میں انھوں نے اس رنگینی اور پرکاری سے کام نہیں لیا ہے۔ برخلاف اس کے اس میں انھوں نے باقاعدگی، سادگی، پختگی اور روانی سے حسن پیدا کیا ہے۔ غرض مولانا عبدالماجد موضوع کی مناسبت سے اسلوب کو پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی اردو نثر میں ان کا ایک منفرد مقام نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ان کے بعض دوسرے ہم عصر مل کر اردو نثر کی روایت میں اپنے اسالیب سے گراں قدر اضافے کرتے ہیں۔ اس طرح علمی، فلسفیانہ، تحقیقی اور تنقیدی موضوعات کو سادہ، رواں، شگفتہ اور شاداب اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کی ایک جان دار

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: انشائے ماجد، ص ۱۲۔

روایت قائم ہوتی ہے جو آگے چل کر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، پروفیسر فراق گورکھپوری، پروفیسر سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، مولانا مہر، مولانا سالکؔ، چراغ حسن حسرت، باری علیگ اور چودھری افضل حق کی تحریروں میں نئی صورتیں اختیار کرتی ہیں۔

۶

بیسویں صدی میں اردو نثر کی روایت کے اس نشیب و فراز کو علامہ اقبال نے بغور دیکھا ہے۔ وہ اس سے متاثر بھی ہوئے ہیں اور انھوں نے نشیب و فراز کے اس عمل کو جاری رکھنے میں نمایاں کام بھی کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا خاص میدان شاعری تھا لیکن انھوں نے نثر نگاری کی طرف بھی اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کے اسالیب نثر سے انھوں نے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ سرسید کی تحریک کے بنیادی اصولوں سے انھوں نے پوری طرح اتفاق کیا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح ذہنی طور پر اس کے ساتھ رہے ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے جس طرح دین اسلام، اسلامی افکار و تصورات، اسلامی تہذیب و تاریخ کو اپنی نثر میں پیش کیا ہے، اس سے وہ کافی متاثر ہوئے ہیں۔ اُردو زبان کو اظہار و ابلاغ کی غرض سے علمی زبان بنانے میں انھیں گہری دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کی ترقی کا خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ اس زبان میں کام کرنے والوں اور نئے مضامین و موضوعات اور نئے اسالیب سے اس کو مالا مال کرنے والوں کی کوششوں کو انھوں نے ہمیشہ مستحسن خیال کیا ہے۔ اپنے عہد کے بیشتر نثر نگاروں سے ان کا ایک رابطہ رہا ہے۔ حالی، شبلی، آزاد اور ان کے بعد مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خاں اور اور مولانا عبدالماجد

سے وہ ذہنی طور پر قریب رہے ہیں اور انھوں نے ان کی نثری تخلیقات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا ہے۔

'مخزن' کی تحریک کے ساتھ وہ پوری طرح وابستہ رہے ہیں۔ اس تحریک نے سر عبدالقادر کی قیادت میں جدید اردو ادب کی دنیا میں جو انقلاب برپا کیا ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ ذہنی طور پر انھوں نے اتفاق کیا ہے بلکہ وہ اس میں شریک بھی رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ہی 'مخزن' اور حمایت اسلام سے کیا۔ سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں :

" ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انھیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اور انھوں نے کہہ سن کر ایک غزل بھی ان سے پڑھوائی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی، سادہ سے الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی۔ مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرے میں انھوں نے غزلیں پڑھیں اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ مگر یہ شہرت پہلے پہلے لاہور کے کالجوں کے طلبہ اور بعض ایسے لوگوں تک محدود رہی جو تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے تھے۔ اتنے میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے اور نظم و نثر کے مضامین کی اس میں مانگ ہوئی۔ شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسے میں وہ نظم، جس میں کوہ ہمالیہ سے خطاب ہے، پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی

چاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ مگر شیخ صاحب یہ عذر کر کے کہ ابھی نظرثانی کی ضرورت ہے، اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ میں نے ادب اردو کی ترقی کے لئے رسالہ 'مخزن' جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالے کے حصۂ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انھوں نے کہا "ابھی کوئی نظم تیار نہیں۔ میں نے کہا "ہمالیہ" والی نظم دے دیجئے اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھئے۔ انھوں نے اس نظم کے دینے میں پس و پیش کی، کیونکہ انھیں یہی خیال تھا کہ اس میں خامیاں ہیں۔ مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی، اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی اور 'مخزن' کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں، جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا، شائع کر دی۔ یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کا پبلک طور پہ آغاز ہوا اور ۱۹۰۵ء تک، جب وہ ولایت گئے، یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں وہ عموماً 'مخزن' کے ہر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے اور جوں جوں لوگوں کو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا، جا بجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمائشیں آنے لگیں اور انجمنیں اور مجالس درخواستیں کرنے لگیں کہ ان کے سالانہ جلسوں میں لوگوں کو وہ اپنے کلام سے محظوظ کریں[1]؎"

---

[1] سر شیخ عبدالقادر: دیباچۂ بانگ درا۔

سرعبدالقادر کی تحریر سے یہ طویل اقتباس صرف اس خیال سے دیا گیا ہے کہ اس سے علامہ اقبال کی ابتدائی ادبی زندگی اور "مخزن" سے ان کے تعلق پہ روشنی پڑتی ہے۔ اس سے اس حقیقت کا پتہ بھی چلتا ہے کہ وہ "مخزن" کے لیے ہر مہینے کچھ نہ کچھ لکھتے تھے، لیکن اپنی تخلیقات کو چھپوانے کے معاملے میں محتاط تھے۔ سرعبدالقادر کی دوربیں نگاہ نے ان کی شخصیت میں ایک جوہر قابل کو تلاش کر لیا تھا اور وہ "مخزن" کے ہر شمارے میں ان کی موجودگی کو ضروری سمجھتے تھے۔ "مخزن" بھی ان کی ادبی شہرت کا باعث بنا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک اہم شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ملک بھر میں مشہور ہو گئے۔

"مخزن" میں اقبال نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی۔ ان کا پہلا مضمون اس اہم رسالے کے جنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ گویا ان کے نثر لکھنے کی ابتدا تھی جس کا آغاز بھی "مخزن" ہی سے ہوا۔ مضمون کا عنوان تھا "بچوں کی تعلیم و تربیت"۔ اس کے بعد انھوں نے ستمبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں "اردو زبان" اور اکتوبر ۱۹۰۲ء کے پرچے میں "اردو زبان پنجاب میں" کے موضوع پر مضامین لکھے اور پھر مضامین لکھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ ۱۹۰۵ء میں انگلستان چلے گئے تو وہاں سے بھی مختلف موضوعات پر رسالہ "مخزن" اور اخبار "وطن" کو اپنے مضامین نثر بھیجتے رہے۔

غرض یہ کہ سر شیخ عبدالقادر ہی نے ان کو "مخزن" میں نثر لکھنے پر آمادہ کیا اور تھوڑے عرصے میں ان کی نثری تحریریں کافی خاصی تعداد میں منظر عام پر آ گئیں۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے، "مخزن" رومانی تحریک کا علمبردار تھا۔ سرسید اور ان کی تحریک نے جو ادب پیدا کیا تھا، اگرچہ اسکی اہمیت کے ارباب مخزن بھی قائل تھے، لیکن اپنے ادب میں ایک رومانی انداز کو پیدا کرنا بھی ان کے پیش نظر تھا۔

چنانچہ اسی رومانی تحریک کے زیرِ اثر اقبال نے بھی نثر لکھی۔ انھوں نے علمی مضامین میں یقیناً سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی سادہ اور آسان زبان کو اپنے اسلوبِ نثر کی بنیاد بنایا لیکن اپنی طبیعت کی مناسبت سے اور مخزن کی تحریک کے زیرِ اثر اس میں رومانی انداز کے رنگ بھی بھرے۔ اس طرح اس عہد کے مختلف رجحاناتِ نثر کے امتزاج سے اپنے اندازِ نثر کا ہیولا تیار کیا اور چند سال میں وہ ایک مخصوص اسلوب نثر کی تشکیل میں کامیاب ہو گئے جس نے انھیں ایک صاحبِ طرز انشاپرداز بنا دیا۔

اقبال نے اس زمانے میں جو نثر لکھی وہ مقدار میں ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے، لیکن جو کچھ انھوں نے نثر میں لکھا ہے اس میں اس عہد کے رجحانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کی نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی ان کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کی تمام نثری تصانیف ان کی اسی انفرادیت کی تصویریں ہیں جن سے ان کی ادبی اور فن کارانہ شخصیت کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرا باب

علامہ اقبال کی تصانیفِ نثر

ا
علم الاقتصاد

"علم الاقتصاد" علامہ اقبال کی پہلی نثری تالیف ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک زمانے تک اس کا دوسرا ایڈیشن شائع نہ ہو سکا۔ بالآخر ۱۹۶۱ء میں اقبال اکیڈمی کراچی نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا اور آج کل اس کتاب کا یہی ایڈیشن ملتا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب اپنے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی 'علم الاقتصاد' ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی دوسری اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اور اشاعت تو درکنار، یہ کتاب نظروں سے ایسی غائب ہوئی کہ کہیں سے ایک نسخہ مہیا کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ خود اقبال نے اپنی اس تصنیف کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ میری ایک عرصے سے یہ تمنا تھی کہ علمی دنیا کو اقبال کی اس قدیم اور

گراں مایہ تصنیف سے روشناس کرایا جائے۔ خوش قسمتی سے لاہور کی پبلک لائبریری میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوگیا۔ اسے عاریتاً اقبال اکیڈمی کے لئے حاصل کیا گیا اور کراچی میں اس نسخے کی ایک عکسی نقل تیار کی گئی۔ موجودہ نسخہ اسی عکس پر مبنی ہے۔" [۱]

اس کتاب کا یہ ایڈیشن پورے اٹھاون سال بعد شائع ہوا ہے۔ اس میں ممتاز حسن صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ مشہور ماہر معاشیات و اقتصادیات ڈاکٹر انور اقبال قریشی کا مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے جن سے علامہ اقبال کی اس کتاب کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی یہ تصنیف نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو میں اوّلیت کا شرف رکھتی ہے بلکہ علمی نثر کے لحاظ سے بھی علامہ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے آج بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ممتاز حسن صاحب اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"علم الاقتصاد' اُردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب ہے۔ اس کے بہت بعد پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر حبیب الرحمٰن اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی مختلف کتابیں اس موضوع پر شائع ہوئیں۔ اور ان کے علاوہ اگرچہ دوسرے مصنفین نے بھی، خصوصاً حیدرآباد میں، وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں اور مقالے لکھے، مگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو معاشیات پر اردو میں کتابوں کی کثرت نہیں ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انھوں نے علم کے اس شعبے میں کسی زمانے میں بھی کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ گذشتہ دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی ہی ایک ایسے مفکر ہیں جنھوں نے انسانی تہذیب

---

[۱] ڈاکٹر ممتاز حسن : پیش لفظ ' علم الاقتصاد، ص ا

تمدن ادوار کے عروج و زوال کے مطالعے کے سلسلے میں معاشی و اقتصادی عناصر و عوامل کا جائزہ لیا۔ یا سید احمد خاں ہیں جنھوں نے "اسباب بغاوت ہند" میں ۱۸۵۷ء کی کشمکش کے معاشی پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز اردو کے مشہور انشا پرداز مہدی حسن نے اپنے آپ کو مہدی افادی الاقتصادی میں لکھا مگر اقتصادیات کے موضوع پر ان کی کوئی مستقل کوشش منظر عام پر نہیں آئی۔ اسلامی معاشیات کے موضوع پر بھی مناظر احسن گیلانی، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ڈاکٹر انور اقبال قریشی اور ڈاکٹر یوسف الدین کی تصنیفات علاوہ اردو میں کم ہی لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی علم 'الاقتصاد' اردو میں اپنی اولیت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔" [1]

اور ممتاز حسن صاحب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ اقبال کی اس کتاب کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو معاشیات و اقتصادیات کے موضوع سے گہری دلچسپی تھی۔ اس موضوع پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور اس مطالعے کی روشنی میں جو نتائج وہ اس موضوع سے متعلق نکالتے تھے وہ ان کے مفکرانہ مزاج اور تجزیاتی انداز پر مبنی تھے۔ اس لئے ان کے یہاں اقتصادی اور معاشی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں جدت فکر، وسعت علم و مطالعہ اور ایک ترقی پسندانہ زاویہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے اس کتاب کی اسی خصوصیت کے پیش نظر اپنے مقدمے کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"یہ امر میرے لئے انتہائی باعث مسرت اور موجب افتخار ہے کہ میں اقبال اکیڈمی کراچی کے توسط سے ایک متاعِ گم گشتہ کی بازیافت میں مدد دے رہا ہوں۔ اقبال کی زیر نظر تصنیف دنیا کے ادبی شاہکاروں کی طرح شراب کہن

---

[1] ڈاکٹر ممتاز حسن: پیش لفظ، علم اقتصاد، ص ۲

کی مانند ہے جس کی ارزش اور پُر مائیگی میں وقت کے گذرنے کے ساتھ کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مختلف علمی میدانوں میں دنیا ان کی خداداد قابلیت اور ذہانت کو خراج عقیدت پیش کر چکی ہے لیکن موجودہ دور میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال کی پہلی تصنیف کا تعلق نہ شاعری سے ہے، نہ فلسفے سے بلکہ ان کی علمی کوششوں کا پہلا ثمر ۱۹۰۳ء میں "علم الاقتصاد" کے نام سے ۲۱۶ صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں لاہور سے شائع ہوا، جس میں معاشیات کے اہم مسائل کو نہایت واضح اور مؤثر طریقے سے سلجھایا گیا ہے۔" [1]

آگے چل کر وہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علم الاقتصاد، اگرچہ ایک ابتدائی کتاب ہے، اور اقبال کی جواں سالی کی علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے، لیکن جہاں جہاں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اپنے زمانے کی معاشی صورت حال پر اپنی طرف سے تنقید کی ہے، اس سے ان کی خداداد قابلیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں، اور ان کی نظر کی وسعت، رائے کی پختگی اور عالی دماغی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ، ان کے معاشیات کے میدان میں بھی کام آتا ہے۔ [2]

غرض ایک ماہر معاشیات نے بھی اس کتاب کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس کو معاشیات کی اہم کتاب قرار دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس کو بیسویں صدی کی علمی نثر کا اعلیٰ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے "علم الاقتصاد" پر شروع میں ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اس کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور زندگی میں اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ چنانچہ

---

[1] ڈاکٹر انور اقبال قریشی: مقدمہ علم الاقتصاد، ص ۱۱ — [2] ایضاً، صفحات ۱۳۔۱۴۔

لکھتے ہیں:

"علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے، اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ یہ انسان کے معمولی کام کاج، اس کے اوضاع و اطوار اور اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے دماغی قوی بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قوی کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلسی آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاق اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔"[1]

انھیں خیالات و احساسات نے علامہ اقبال کے دل و دماغ میں اس کتاب کو لکھنے کی تحریک پیدا کی ہے، اور اس کا مقصد ان کے خیال میں یہ ہے کہ افراد تمدن میں اقتصادیات کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی روشنی میں اپنی حالت کو معلوم کر کے اس کو بہتر بنانے کے لئے منصوبہ بندی کر سکیں۔ علامہ نے واضح طور پر اسکے

[1] علامہ اقبال: دیباچہ "علم الاقتصاد" ص ۲۳۔

دیباچے میں لکھا ہے کہ :

" میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کردوں اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کردوں کہ یہ تمام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی " [۱]

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے اس کتاب کو ایک خاص مقصد کے تحت عام فہم زبان میں لکھا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ کاش اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔

علامہ اقبال نے " علم الاقتصاد " کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کے طریق تحقیق پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے حصے میں زمین، محنت اور سرمائے پر اظہار خیال کیا ہے۔ تیسرے حصے میں مسئلہ قدر، تجارت بین الاقوام، زر نقد کی ماہیت اور اس کی قدر، حق الضرب، زر کاغذی، اعتبار اور اس کی ماہیت کی تفصیل پیش کی ہے۔ چوتھے حصے میں " پیداوار دولت کے حصہ دار " کے عنوان کے تحت لگان، سود، منافع، اجرت، مقابلۂ نامکمل کا اثر دستکاروں کی حالت پر اور مال گذاری وغیرہ کے موضوعات پر نہایت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ پانچویں حصے میں آبادی درجہ معیشت، جدید ضروریات کا پیدا ہونا اور صرف دولت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے۔ غرض یہ کتاب اپنے اندر نہ صرف معلومات کے اعتبار سے وسعت اور ہمہ گیری رکھتی ہے بلکہ زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی منفرد نظر آتی ہے۔ کیونکہ جس زمانے میں یہ لکھی گئی، اس زمانے میں اس انداز کی

---

[۱] علامہ اقبال : دیباچہ ' علم الاقتصاد ' ص ۲۳

نثر لکھنے کا رواج عام نہیں تھا۔

"علم الاقتصاد" کے پہلے باب میں علامہ اقبال نے اس علم کی اہمیت اس طرح واضح کی ہے :

"علم الاقتصاد علم انسانی کے اس خاص حصے کا نام ہے جس کا نام دولت ہے اور جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور استعمال کے اصول و اسباب و طریق کیا کیا ہیں؟ لہٰذا اس علم کے طالب کا یہ فرض ہے کہ اپنی تحقیق و تدقیق کو دیگر علوم کی تحقیق سے مخلوط نہ کرے۔ کیونکہ کسی علم کی ترقی اس امر پہ منحصر ہے کہ اسے دیگر علوم کے سلسلے سے منفرد سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔

بعض حکماء کی یہ رائے ہے کہ علم الاقتصاد وسیع علم تمدن کا ایک جزو ہے، اور چونکہ تمدنی زندگی کی بعض صورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس واسطے ان میں سے کسی ایک کا منفرد مطالعہ کرنا کچھ نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ انسانی افعال کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ علمی نظر کامل طور سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، کسی علم کے علم بننے کے لئے اس کی تخصیص ضروری ہے"۔[1]
آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"کیا علم الاقتصاد کا مطالعہ دولت کی محبت پیدا کرتا ہے؟ بعض لوگ اس بات پہ مصر ہیں کہ اس علم کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے مفید نہیں ہے کیونکہ اس سے دولت کی محبت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو تمام اخلاقی نیکیوں کے ناقابل کر دیتی ہے اور اسے ایک سنگدل دنیادار بنا دیتی ہے۔ اس لغو اعتراض کے جواب میں اول تو

---

[1] علم الاقتصاد، ص ۳۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ انسان کی غرض صرف دولت ہی نہیں ہے تاہم یہ بڑی ضروری اغراض میں سے تو ہے، اور اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جاوے۔" [۱]

علم الاقتصاد کے ابتدائی اصولوں کی وضاحت تو انھوں نے اس طرح کی ہے:

"علم الاقتصاد کے اصول ابتدائی کیا کیا ہیں؟ اس ضمن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اصول اولیہ اور واقعات کیا ہیں جن کی بناء پر علم الاقتصاد کا ماہر اپنے استدلال کو قائم کرتا ہے؟ کیا اس استدلال میں ان تمام واقعات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو دولت پر اثر کرتے ہیں یا صرف چند ضروری واقعات پر قناعت کرنی چاہیئے؟ کیا نتائج کلیہ پر پہنچنے کے لئے انسان کی حقیقی فطرت کا مطالعہ لازم ہے؟ یا اس غرض کے لئے ہمیں ایک خیالی انسانی فطرت کا تصور کرنا چاہیئے جس کا ہر فعل اوروں کے لئے نمونہ ہو؟ کیا مختلف ممالک حالات زمین و آب و ہوا اور زرعی قابلیت اور لوگوں کے عادات اور ان کے اوضاع و اطوار کا معلوم کرنا ضروری ہے؟ یا صرف انھیں حالات و اوصاف کا علم ضروری ہے جو بالاشتراک ہر قوم میں پائے جاتے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب پر علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق منحصر ہے۔ مگر اس بارے میں حکما کے درمیان بڑا اختلاف رائے ہے بعض کے نزدیک اس علم کے ابتدائی اصول صرف چند واقعات ہیں جن کا تعلق انسانی فطرت، انسانی تمدن اور کرۂ ارض کی طبعی بناوٹ کے ساتھ ہے، اور بعض کے نزدیک علم الاقتصاد کے ماہر کا یہ فرض منصبی ہے کہ انسانی فطرت کے کسی ایسے واقعے کو نظر انداز نہ کرے جس کا تعلق دولت یا دولت کی تقسیم اور پیدائش کے ساتھ ہو۔ لہٰذا ان حکما کی رائے میں جوں جوں انسانی فطرت کا علم

---

[۱] علم الاقتصاد، ص ۳۔

وسیع ہوتا جاتا ہے توں توں علم الاقتصاد بھی وسعت حاصل کرتا جاتا ہے"۔[۱]
غرض اس طرح وہ اس کتاب میں اقتصادیات اور معاشیات کے تمام پہلوؤں کی
کی وضاحت آسان اور سادہ اور علمی زبان میں کرتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس
زمانے میں، جب اس طرح کے علمی موضوعات کو اردو میں پیش کرنے کی کوئی باقاعدہ روایت
نہیں تھی، علامہ اقبال نے اپنی اس کتاب میں ان کو بڑی روانی کے ساتھ پیش کیا۔ ظاہر
ہے کہ ایسے موضوعات کو پیش کرتے ہوئے ادبیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ البتہ آسان، سادہ اور
عام فہم زبان میں روانی کے ساتھ اس قسم کے علمی موضوعات کو پیش کر دینا ہی ایک بہت بڑا
کارنامہ ہے اور علامہ اقبال نے یہ کارنامہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

۲

مقالاتِ اقبال

"مقالاتِ اقبال" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، علامہ اقبال کے مضامین و مقالات
کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات کو سید عبدالواحد معینی صاحب نے مرتب کیا اور شیخ محمد اشرف نے
مئی ۱۹۶۳ء میں لاہور سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔
عبدالواحد نے اس مجموعے میں علامہ اقبال کے ان تمام مضامین و مقالات کو یکجا
کر دیا ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف رسائل و اخبارات میں لکھے تھے۔
شروع میں وہ مضامین ہیں جو ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک "مخزن" میں شائع ہوتے تھے۔
اس کے بعد وطن میں شائع ہونے والے خطوط ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان
سے اس رسالے کے ایڈیٹر کو لکھے تھے۔ اس کے بعد کچھ مضامین ایسے ہیں جو خطبات یا بعض

---

[۱] علم الاقتصاد، ص ۱۵-۱۶

کتابوں کے دیباچوں کے طور پر لکھے گئے تھے ۔ غرض اس مجموعے میں علامہ اقبال کی تقریباً تمام اہم تحریریں یکجا ہیں، سوائے خطوط کے جو اس مجموعے کی اشاعت سے قبل ہی مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ۔

اس مجموعے میں جو مضامین و مقالات شامل ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں : بچوں کی تعلیم و تربیت (۱۹۰۲ء)، زبانِ اردو (۱۹۰۲ء)، اردو زبان پنجاب میں (۱۹۰۲ء)، قومی زندگی (۱۹۰۴ء)، اقبال کے دو خطوط ایڈیٹر 'وطن' کے نام (۱۹۰۵ء)، خلافتِ اسلامیہ (۱۹۰۸ء)، ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر (۱۹۱۰ء)، پین اسلامزم (۱۹۱۱ء)، ایک دلچسپ مکالمہ (۱۹۱۴ء)، دیباچہ مثنوی 'اسرارِ خودی' (اشاعت اول (۱۹۱۵ء)، اسرارِ خودی اور تصوف (۱۹۱۶ء)، تصوفِ وجودیہ (۱۹۱۶ء)، جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ (۱۹۱۷ء)، دیباچہ مثنوی 'رموزِ بے خودی' (اشاعت اول (۱۹۱۸ء)، دیباچہ مثنوی 'اسرارِ خودی' (اشاعت دوم)، محفلِ میلاد النبی، دیباچہ پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) تقاریظ بر تصانیفِ فوق مرحوم، اراکین انجمن حمایت اسلام کے نام، کابل میں ایک تقریر (۱۹۳۳ء)، جغرافیائی حدود اور مسلمان (۱۹۳۸ء)، اسلام اور علوم جدیدہ اور خطبۂ عید الفطر ۔

غرض اس مجموعے میں علامہ اقبال کی بیشتر ایسی بکھری ہوئی نثری تحریریں یکجا ہیں جو انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین و مقالات کی صورت میں شائع ہوئی تھیں ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واحد مجموعہ ہے جس میں علامہ اقبال کی بیشتر اہم تحریریں پڑھنے والے کو یکجا مل جاتی ہیں ۔

اس مجموعے کے شروع میں عبد الواحد صاحب کا 'پیش لفظ' اور سید عبد اللہ صاحب کا 'مقدمہ' بھی شامل ہے ۔

سید عبد الواحد صاحب نے اپنے 'پیش لفظ' میں علامہ اقبال کی نثری

تحریروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کی نثر نگاری پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"راقم الحروف نے اپنی تصنیف "فکر و فنِ اقبال" کے آخری باب علامہ مرحوم کی نثر نگاری کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مبصر نے اس باب کے متعلق تحریر فرمایا تھا کہ جہاں تک انگریزی نثر کا تعلق ہے، ڈاکٹر صاحب کے لیکچروں کا مجموعہ انگریزی داں دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کی بنا پر ڈاکٹر صاحب انگریزی زبان کے بلند پایہ ادیبوں میں شریک ہو گئے ہیں، لیکن مرحوم کی اردو نثر نگاری کے متعلق ایسا دعویٰ غیر ضروری ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ علامہ کو تفکرات زمانہ اور گوناگوں مصروفیتوں نے اس کی مہلت نہ دی کہ وہ اردو نثر کو بھی اپنی غیر فانی نظموں کی طرح ایک گراں مایہ سرمایہ عطا کرتے۔ پھر بھی جس ادیب کی پہلی تصنیف مختلف نظموں کو چھوڑ کر، اردو نثر میں ہو اور جو اپنی معرکتہ الآرا نظموں کے ساتھ ساتھ اردو میں بیش بہا مضامین بھی لکھتا رہا ہو، اس کی نثر نگاری کو نظر انداز کرنا صریح بے انصافی ہوگی۔ اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ علامہ کی پہلی تصنیف 'علم الاقتصاد' ایک فنی کتاب ہونے کی وجہ سے ادبی چٹخاروں اور شوخیوں سے خالی ہے، مگر اس فن پر اردو زبان میں پہلی تصنیف ہونے کی وجہ سے ایک منفردانہ حیثیت کی حامل ہے، اور ہم اس کو ہر لحاظ سے ایک معیاری تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔ اورینٹل کالج کے پرانے کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں علامہ نے 'علم الاقتصاد' تصنیف کی اسی زمانے میں انھوں نے مرقومہ ذیل دو

انگریزی کتابوں کی تلخیص اور ترجمہ بھی تیار کیا تھا: اسٹبس (STUBBS) کی تصنیف EARLY, PLANTAGENT (۲) واکر (WALKER) کی تصنیف POLITICAL ECONOMY۔ ان تصانیف کے علاوہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس علامہ کے مکاتیب کے بیش بہا مجموعے ہیں۔ ان مکاتیب میں بھی علامہ نے زیادہ تر ادبی یا فنی موضوعات سے بحث کی ہے"۔[1]

آگے چل کر ان مقالات اور ان کی ترتیب کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"الغرض علامہ اقبال کا اُردو نثر پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ایک کتاب، دو ترجمے اور مکاتیب کے متعدد مجموعے چھوڑے، مگر اردو نثر کی خدمت میں علامہ کی مساعی ان کارناموں ہی تک محدود نہ تھیں۔ جس زمانے میں "مخزن" میں علامہ مرحوم کی معرکۃ الآرا نظمیں اور غزلیں شائع ہو رہی تھیں اسی زمانے میں علامہ نے اس شہرۂ آفاق جریدے میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی علامہ کا مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت" تھا جو مخزن میں ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سلسلۂ مضامین ۱۹۰۵ء تک جاری رہا، جس سال علامہ حصول تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے"۔

واحد صاحب نے اس تفصیل کو پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ علامہ کے یہ مضامین نثر بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنی یہ نثری تصانیف پیش کرکے اردو نثر کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

علامہ اقبال کے مضامین سب سے پہلے حیدرآباد میں تصدق حسین صاحب تاج حیدرآبادی نے "مضامین اقبال" کے نام سے شائع کئے تھے۔ اسی کو بنیاد بنا کر

---

[1] سید عبدالواحد معینی: مقالاتِ اقبال، پیش لفظ، ص "ب"۔

واحد صاحب نے "مقالات اقبال" کے نام سے، اضافے کے ساتھ، علامہ اقبال کے مضامین نثر کو شائع کیا ہے۔ ان مضامین میں دو مضمون ایسے ہیں جو علامہ نے انگریزی میں لکھے تھے لیکن ان کے ترجمے اس مجموعے میں شامل کر لئے گئے ہیں۔

ISLAM AS A SOCIAL AND POLITICAL IDEAL کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا اور "اسلام میں خلافت" کے موضوع پر علامہ کے مضمون کا ترجمہ چودھری محمد حسین صاحب نے کیا تھا۔ ان دو مضامین کے علاوہ بقیہ تمام مضامین ایسے ہیں جو علامہ نے خود اردو میں لکھے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ نے اس کے مقدمہ میں "جسارت" کے عنوان سے لکھا ہے اور اس میں ان مقالات کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال کے مضامین کے چند اہم اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہو:

"پڑھے ہوئے شاگردوں کو پڑھانا ایک آسان کام ہے، مگر انجان بچوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلم اس کی دقتوں سے ابھی پورے طور پر آشنا نہیں۔ ہمارا پرانا طریقۂ تعلیم چونکہ بچوں کے قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارجِ نمو کو ملحوظ نہیں رکھتا، اس واسطے اس کا نتیجہ ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ان کے قوائے ذہنیہ برباد ہو جاتے ہیں اور ان کے چہروں پر ذکاوت کی وہ چمک نظر نہیں آتی جو اس بے فکری کی زندگی کے ساتھ مختص ہے۔ بڑی عمر میں یہ تعلیمی نقص اور بھی وضاحت دکھائی دیتا ہے۔ روزمرہ کے معاملات کا سمجھنا اور ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانا، جو ایک علمی طبیعت کے آدمی کے لئے نہایت ضروری اوصاف ہیں، ان میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی ناکامیوں کا ایک

افسوسناک سلسلہ ہوتی ہے اور سوسائٹی کے لئے ان کا وجود محض معطل ہو جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثنا خواں بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لئے اس کا وجود زینت کا باعث ہو، اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے اسکے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو، جسکی کرنیں اوروں پر پڑ کے ان کو دیانتداری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینے سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دور کر کے اُسے مجلّا و مصفّا کر دیتی ہے صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بہائم کی زندگی ہوتی ہے، کیونکہ ان کا ہر فعل خود غرضی اور بے جا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے تاثرات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد تک محدود ہوتا ہے اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بحیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع سے ہے حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔ اس قسم کا کامل انسان بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر انسانی بچے کی تربیت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جاوے، کیونکہ یہ کمال اخلاقی تعلیم و

تربیت ہی کی وساطت سے حاصل ہو سکتا ہے. جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصول کو مد نظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں. جس کا نتیجہ تمام افراد سوسائٹی کے لئے انتہا درجے کا مضر ہوتا ہے." ؏۱

"ابھی کل کی بات ہے، اُردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا، اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے. ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے." ؏۲

"قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے بلکہ اگر اسے اقوام عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا منظور ہے تو اپنی آئندہ نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریق عمل اختیار کرے جس کے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاف کا تمدن بھی شامل ہو. ایک زمانہ تھا جب کہ اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے

؏۱. سید عبدالواحد معینی : مقالات اقبال، صفحہ ۲۷۱

؏۲. ایضاً۔ صفحات ۲۰، ۳۹، ۴۰۔

ہوا کرتا تھا اور یہ فولادی حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا ان کے افراد کی تعداد، ان کے زور بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی، بلکہ ان کی زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ آج کل کی جنگوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قومیں ہتھیار بند ہوں، ایک خاص میدان میں آراستہ ہو کر جدال و قتال کا بازار گرم کریں۔ نہ آج کل یہ ضروری ہے کہ کوئی قوم کسی ہمسایہ قوم پر فتح پانے کے لئے اس کے ملک پر چڑھائی کرے۔ یہ تمام سامان زمانۂ قدیم کے ساتھ مختص ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک اور خاموش قوت ہے جس پر قوموں کی بقا و فنا انحصار رکھتی ہے اور جس کے بل پر ایک قوم گھر بیٹھے دوسری قوم کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹا سکتی ہے۔ ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گذر چکا۔ اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔ ظاہری فاصلہ جو قوموں کے خلاو ملا میں بمنزلہ ایک سدِ سکندری کے تھا اب ریل اور پیامِ برقی کی حیرت انگیز ایجادوں سے گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے، اور وہ ممالک جو کبھی ناپیدا کنار سمندروں کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر دور تھے کہ ایک دوسرے کی ہستی کا بھی علم نہ تھا موجودہ صدی میں فنِ جہازرانی کی تعجب خیز ترقی سے ایک شہر کے دو محلوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں، جس سے دنیا کی تمام قومیں ایک دوسرے کی

تہذیب و تمدن سے روز بروز متاثر ہو رہی ہیں"۔ [1]

"زمانۂ جاہلیت میں ملک عرب کئی مختلف قبائل پر منقسم تھا جو ہمیشہ باہم دگر برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ہر قبیلہ کا اپنا جداگانہ سردار، جداگانہ معبود اور جداگانہ شاعر ہوتا تھا۔ شاعر کا جذبۂ حبِ قومی اپنے قبیلے کے اوصاف و فضائل کی شان و عظمت کو منصۂ شہود پر لانے میں صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ ان ابتدائی اجتماعی نظاموں میں ایک خاص حد تک باہمی تعلقات قائم تھے، تاہم یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیادت اور آنحضرت کے مذہب کی عالمگیرانہ حیثیت کا کرشمہ تھا کہ امارت و ریاست کے وہ تمام منتہا و مقاصد، جن کے لئے ہر قبیلہ ساعی و سرگرداں رہتا تھا، حرفِ غلط کی طرح اعراب کے صفحۂ ضمیر سے محو و مفقود ہو گئے اور جھونپڑیوں اور خیموں میں بسر کرنے والے ایک مشترک وسعت طلب نظام میں بصورتِ ملّتِ واحدہ جلوہ نما ہونے لگے۔ اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لئے ہمارے مقاصدِ بحث اس امر کے مقتضی ہیں کہ ہم مبادیات ہی میں عرب قبائل کے مراسم وراثت و دستورِ جانشینی کے تمام پہلوؤں کو بالتفصیل بیان کر دیں اور اس نظام اور ضابطے کا ذکر کر دیں جو کسی سردارِ قبیلہ کی وفات کے ارکان کو ملحوظ رکھنا ہوتا تھا۔

جب کسی عرب قبیلہ کا سردار یا شیخ مر جاتا تو قبیلے کے تمام اکابر ایک جگہ جمع ہوتے اور ایک دائرے کی شکل میں مجلس منعقد کر کے جانشینی کے معاملات پر بحث و تمحیص کرتے۔ قبیلے کا کوئی رکن جس کو معتبر و مقتدر خاندانوں کے اکابر و رؤسا

---

[1] ایضاً، کتاب مذکور۔

باتفاق رائے منتخب کردیں۔ قبیلے کا رئیس بن سکتا تھا۔ بقول وان کریمر روایتی بادشاہت کا مفہوم عرب دل و دماغ سے ہرگز مانوس نہ تھا۔ ہاں کبر سنی و بزرگی کا اصول، جس کو موجودہ سلطنت ترکی کے نظام حکومت میں سلطان احمد اول کے زمانے میں قانوناً تسلیم کرلیا گیا، یقیناً انتخاب کے وقت منتخب کرنے والوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔ اگر کبھی یہ مشکل آپڑتی کہ قبیلے کا ایک حصہ ایک سردار کی حمایت میں ہو اور دوسرا نصف دوسرے کی حمایت میں تو دونوں فریق اس وقت تک، جبکہ ایک سردار اپنے حقوق سے دستبردار نہ ہو جائے، ایک دوسرے سے جدا رہتے، ورنہ بصورت دیگر شمشیر فیصلہ کرتی۔ جو سردار اس طرح منتخب ہوتا، قبیلے کو اختیار تھا کہ اگر اس کی روش کو جادۂ اعتدال سے منحرف پائے تو اسے معزول کردے۔ اسلام کے ظہور کے بعد جوں جوں عرب فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا، نظر و تدبر کے دائرے وسعت پکڑتے گئے۔ یہ ابتدائی رسم بتدریج بڑھتے بڑھتے ایک سیاسی اصول میں متبدل ہو گئی جس کے وضع کرتے ہیں، جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، اسلام کے ماہرین قانون اساسی نے نئے نئے سیاسی حالات اور تجربوں پر اپنے اجتہاد و تفقہ کی بنا رکھی۔"[1]

"انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقا کی الم ریز جھلملیوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریز پا نظاروں کی طرح ہم گذری ہوئی قوموں، سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈرات کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت، اس کے اٹل قوانین برابر اپنا

---

[1] سید عبدالواحد معینی: مقالات اقبال، صفحات ۸۵، ۸۶، ۱۱۵۔

عمل کئے جا رہے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزل مقصود ہی وہ ہے جیسے مقاصد انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں، لیکن:

آدمی زادہ طرفہ معجونیست

یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکما و علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی افتاد طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا علمی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی۔" [1]

---

[1] سید عبد الواحد معینی: مقالات اقبال، صفحات ۱۵۳، ۱۵۴۔

"اکثر احباب نے اس امر کی شکایت کی ہے کہ اقبال نے تصوّف کی مخالفت کی ہے اور بہت سے استفسار میرے پاس پہونچے ہیں۔ مجھے اس امر کی شکایت ہے کہ اس وقت بہت کم لوگ ہندوستان میں ہیں جنھوں نے اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا ہے مسلمانوں کی ذہنی تاریخ عجیب و غریب قسم کی عقلی اور مذہبی تحریکوں کا نشان ملتا ہے۔ اور یہ بات کچھ اسلامی تہذیب کی تاریخ سے خاص نہیں، بلکہ دنیا کی ہر تہذیب کی تاریخ میں ایسی تحریکیں پیدا ہوا کرتی ہیں اور مرورِ زمانہ سے ان تحریکوں میں ایسے عناصر کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے جو اس تہذیب کی خاص روایات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ تصوف کا لٹریچر بہت وسیع ہے اور اس گروہ میں عجیب و غریب حالات رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس امر کے متعلق کچھ آگاہی چاہتے ہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ علامہ ابن جوزی کی "تلبیسِ ابلیس" کے اس حصے کا مطالعہ کریں جو انھوں نے تصوف پر لکھا ہے۔ علمائے اسلام نے صوفیہ کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر وہ کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ عام ناظرین کے لئے علامہ ابن جوزی کی کتاب کافی ہے جو اردو میں بھی شائع ہو گئی ہے۔" [1]

"مقالاتِ اقبال" سے یہ طویل اقتباسات صرف اس خیال سے یہاں نقل لئے گئے ہیں کہ ان سے ان مضامین و مقالات کے ان موضوعات سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے جن پر علامہ اقبال نے قلم اٹھایا ہے۔ اور ساتھ ہی ان کو پیش کرنے کے لئے جو اسلوبِ نثر انھوں نے استعمال کیا ہے، اس سے بھی آشنا ہونے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو نثر میں مقالات

[1] سید عبد الواحد معینی: مقالات اقبال، صفحات ۱۶۰-۱۶۱

اقبال کی اہمیت کیا ہے۔

۳

اقبال نامہ

(مجموعہ مکاتیب اقبال، حصہ اول)

"اقبال نامہ" علامہ اقبال کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جس کو شیخ عطاء اللہ صاحب استاد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ۱۹۴۴ء میں مرتب کیا اور شیخ محمد اشرف نے ۱۹۴۵ء میں لاہور سے شائع کیا۔ شروع میں اس کے مرتب شیخ عطاء اللہ صاحب کا لکھا ہوا 'پیش لفظ' اور حبیب الرحمن خاں شروانی صاحب کا 'مقدمہ' ہے۔ اس مجموعے میں علامہ اقبال کے ایسے خطوط شامل ہیں جو انھوں نے اپنے اہم ہم عصروں کے نام لکھے تھے۔

شیخ عطاء اللہ صاحب نے ان خطوط کو بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ جمع کیا ہے اور بڑے سلیقے سے اس کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ترتیب کے متعلق مختلف نظریات پیش نظر تھے، لیکن میں نے ہر مکتوب الیہ کے نام کا مجموعہ علیحدہ علیحدہ یکجا درج کرنا پسند کیا ہے۔ ترتیب مکاتیب کے سلسلے میں تقدّم و تاخر کو اہم نہیں سمجھتا۔ اہمیت تو خطوط کو حاصل ہے۔ مولانا احسن مرحوم کے نام کے خط سے 'اقبال نامہ' کا اس لئے آغاز کیا گیا ہے کہ یہی سب سے پرانا خط اس وقت تک دستیاب ہو سکا ہے۔ اس کے بعد نواب صدر یار جنگ بہادر کے نام کے مکاتیب ہیں جو کہ مجھے سب سے پہلے موصول ہوئے اور اپنی قدامت کے لحاظ سے بھی اسی کے حقدار ہیں۔ خطوط مختلف اوقات میں موصول ہوتے رہے اور یکے بعد دیگرے پریس کے لئے تیار ہوتے رہے۔ اقبال کے افکار، اس کے ذوق و شوق، اس کی معارف پروری، اس کی اسلام دوستی اور

مذہب پرستی کے نایاب اور آب دار موتیوں کا ایک پورا خزانہ پیش خدمت ہے۔[۱]
اور اس میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس مجموعے میں واقعی علامہ اقبال کے نہایت ہی اہم خطوط شامل ہیں. کیونکہ ان خطوط سے علامہ اقبال کی سیرت اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے، مختلف موضوعات پر ان کے خیالات ونظریات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے اسلوب نگارش کی صحیح قدروقیمت بھی معلوم ہوتی ہے.

اس مجموعے کے چند اہم خطوط کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے اس حقیقت کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا:

"مکرم بندہ جناب میر صاحب. السلام علیکم!

دونوں رسالے پہونچے. سبحان اللہ! نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے. افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں دی. ان شاء اللہ تعالی امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا. ایک تکلیف دیتا ہوں. اگر آپ کے استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا، بہت ممنون ہوں گا. اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے. میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کئے ہیں. چنانچہ انگریزی، جرمن اور فرنچ شعرا کے فوٹوز کے لئے امریکہ لکھا ہے. غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا. اگر آپ کو معلوم ہو تو ازراہِ عنایت جلد مطلع فرمائیے. حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے. والسلام

خاکسار، محمد اقبال

۲۸ رفروری ۱۸۹۹ء ازلاہور، گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس

---

[۱] اقبال نامہ، ص "ت"۔

از لاہور، بھاٹی دروازہ

مخدوم ومکرم حضرت قبلہ خان صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ آج صبح ملا حقیقت یہ ہے کہ آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی بعض بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے، بالکل درست ہے، بالخصوص لفظ "پہ جبہ" کے متعلق مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔ میرے اصل مسودے میں، جو ایک دوست نے لکھا تھا، غلطی سے "تو" کی جگہ "جو" لکھا گیا۔ وہیں سے کاتب نے نقل کی (میری ہستی ہے تو کیا تھی ـــــ الخ)۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے تو ڈکٹیٹ کرایا تھا "طور پر تم نے جو اے حضرت موسیٰ" ـــــ الخ اصل مصرع "طور پہ تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا" ہے۔ کاتب نے یہ سمجھ کر کہ پیغمبروں کے نام کے ساتھ "حضرت" آیا کرتا ہے، یہ لفظ لکھ دیا اور اصل لفظ کو زور عادت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ اس نظم کے بعض اشعار میں بھی کچھ قابل اعتراض باتیں ہیں۔ اس سال مجھے امید نہ تھی کہ میں کوئی نظم پڑھ سکوں گا۔ مڈل کے امتحان کے پرچوں سے فراغت نہ ہوئی، طبیعت کو یکسوئی کس طرح نصیب ہوتی۔ یہ نظم جلسۂ سالانہ سے تین روز پہلے لکھی گئی اور ہفتے کی شام کو مطبع میں بھیجی گئی۔ رات کو کاتب نے لکھی اور جلدی میں بندوں کی ترتیب میں بھی غلطی کر گیا۔ میں نے اس کا ایک مصرع بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں لکھا بلکہ جاری میں جو کچھ منہ میں آیا ڈکٹیٹ کراتا گیا۔ ان حالات کی وجہ سے بعض بعض اشعار میں کچھ نقص رہ گئے۔ لفظ "پہ جبہ" میں خصوصیت سے آپ کا مشکور ہوں، کیونکہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی۔

آپ نے جو دیباچہ اس کے اشعار میں لکھے ہیں ان کے لئے آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں۔ اگرچہ

جلسے میں ہر طرف سے لوگ حسبِ معمول ان کی تعریف کرتے تھے مگر جو مزا مجھے آپ کی داد سے ملا ہے اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ افسوس ہے اب کے آپ تشریف نہ لا سکے۔ میر نیرنگ تشریف لائے تھے، چودھری خوشی محمد تھے، مولانا گرامی بھی تھے۔ غرضیکہ محفلِ احباب کے سب ارکان مشیدہ موجود تھے۔ اگر آپ ہوتے تو ایک آدھ رات خوب گذر جاتی۔ حبیب کی موجودگی شعرا کے لئے کافی سامان ہے اور بالخصوص جب کہ حبیب شعر فہم اور شعر گو بھی ہو۔

ایف۔ اے کے امتحان کے پرچے مضمون تاریخ یونان و روم کے دیکھ رہا ہوں۔ سامنے بنڈل رکھا ہے اور نتیجہ بھیجنے میں چار دن کا عرصہ باقی رہ گیا ہے، لہٰذا مجبوراً بس کرتا ہوں، معاف کیجئے گا۔ اب کے 'مخزن' میں میری دو غزلیں نئی طبع ہوں گی۔ امید ہے آپ پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

مولانا گرامی میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پوچھتے ہیں خط کس کو لکھ رہے ہو؟ میں کہتا ہوں "حبیب" کو، تو فرماتے ہیں میرا بھی سلام لکھ دو۔ آخر شاعر ہیں نا۔ والسلام

آپ کا مخلص، اقبال

بابو صاحب مکرم

یہ کوئی صاحب چھوٹے شملہ سے میری غزل کی اصلاح کر کے ارسال کرتے ہیں۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے اور عرض کیجئے کہ بہتر ہو اگر آپ امیر و داغ کی اصلاح کیا کریں۔ مجھ گمنام کی اصلاح کرنے سے آپ کی شہرت نہ ہوگی۔ میرے بے گناہ اشعار کو جو حضرت نے تیغِ قلم سے مجروح کیا ہے اس کا صلہ انھیں خدا سے ملے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کو عقل و فہم عطا کرے۔ میں تے یہ دو حرف

محض ازراہ ہمدردی تحریر کئے، اُمید ہے وہ برا نہ سمجھیں گے۔ اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں، فطرت انسانی ہی اسی قسم کی ہے۔

راقم آثم، محمد اقبال

لاہور، ۱۹۰۴ء

لاہور، ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء

جناب مولانا گرامی مدظلہ العالی!

گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن؟ اس سوال کے جواب کے لئے حسب الحکم مراقبہ کیا گیا۔ جو انکشاف ہوا، عرض کیا جاتا ہے۔ گرامی مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے، پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی، نہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ کو جذب کر لیتا ہے۔ عدم بود کو کھا جاتا ہے، پستی بلندی میں سما جاتی ہے، مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو، اسے کون جذب کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت، حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقص مٹا چکی ہے۔ شاید نفیر نام ایک شخص تھا جو پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا دیتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضورؐ شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمعِ عام میں آپ نے علی مرتضیٰ کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ ذوالفقارِ حیدری نے ایک آن میں اس کمبخت کا خاتمہ کر دیا لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں

میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی، جس کا قلب تاثرات لطیفہ کا سرچشمہ تھا، اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نفیر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنے تو حضورؐ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے، یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نفیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا" یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے" اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا "یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے"۔ پھر حکم دیا کہ نفیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔

غرض کہ اس طرح مسلم حنیف جذبات متناقض، یعنی قہر و محبت، اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور اس کا دائرۂ اثر اخلاق تناقضات تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت کا اور ابراہیمیت کا، کیونکر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے، اور اس کی قوت جاذبہ ذوتی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک کفِ پا سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا۔

محمد اقبال، لاہور

لاہور، ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا جس کو پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ الحمدللہ کہ آپ کو مثنوی

پسند آئی۔ آپ ہندوستان کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے، اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی۔ بہر حال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں، بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اس سے بہتر ہے۔ محض ذوق شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اٹھا سکتا ہے جیسا کہ خود شاعر، اور تصنیف کی شدید تکلیف اسے اٹھانی نہیں پڑتی۔

یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی ہے مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، کام بڑھتا ہی جاتا ہے، لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے، گو تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا، اور صحابۂ کرام کی زندگی سے

کہاں تک ان کی تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جن کا تصوف حامی ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا خادم، محمد اقبال

لاہور، ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء

مکرم بندہ۔ السلام علیکم

آپ کا خط مجھے مل گیا ہے جس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے مضامین نہایت اچھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقائق اسلامیہ کی سمجھ عطا کی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاط ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے، اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں مثنوی "اسرارِ خودی" کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس حصے میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔

حافظ پر ایک طویل مضمون شائع ہونے کا مجھے بھی احساس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو باحسن وجوہ اتمام کر سکتے ہیں۔ آپ کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ جو سامان عقلی و اخلاقی ایسا مضمون لکھنے کے لئے ضروری ہے، وہ سب آپ میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش

کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ اور اسلام کے ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً:

غازی زپئے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت این بآن کے مانند
این کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف، مگر انصاف سے دیکھیے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر

دیا ہے، بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

اس نکتۂ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ اگر آپ حافظ پر لکھیں تو اس نکتۂ خیال کو ملحوظ رکھیں جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب وغریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک رستے پر پڑ جائے۔ انشاءاللہ 'اسرار خودی' کے دوسرے حصے میں بتاؤں گا کہ شعر کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے

ایک اور مضمون لکھ رہا ہوں جو 'وکیل' میں شائع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسی جماعت پیدا کر دے جو بقول آپ کے اسلام کے نادان دوستوں کی پیدا کی ہوئی آویزشوں کے خلاف جہاد کرے۔

والسلام
آپ کا مخلص، محمد اقبال

لاہور، ۱۷ر اپریل ۱۹۲۲ء

مخدومی۔ السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

مجھے آپ سے قلبی تعلق ہے اس واسطے ہمیشہ آپ کے خط سے مسرت ہوتی ہے۔

'پیامِ مشرق' اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں لیکن افسوس ہے انھیں ختم نہ کر سکا۔ فکرِ روزی قاتلِ روح ہے۔ یکسوئی نصیب

نہیں ۔ ان سب باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے ۔ آپ کے نوجوان دوست کے تبصرۂ پیام کو میں شوق سے پڑھوں گا ۔ میرے ایک سکھ دوست 'اسرار خودی' کا 'بھگوت گیتا' سے مقابلہ کر رہے ہیں ۔ ان کی تحریر انگریزی میں ہو گی ۔

میرے کلام کی مقبولیت محض فضل ایزدی سے ہے ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا اور اعمال صالحہ کی شرط بھی مفقود ہے ۔

مولانا کی کتاب 'فیہ ما فیہ' کو آپ خود ایڈٹ کریں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں ۔ لیکن آخر ہندی مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے ۔ میری رائے میں آپ یہ ضروری کام خود کریں ۔ بعد میں یورپین ایڈیشن بھی نکل آئے گی ۔ جوہر کے نعتیہ کلام کو میں نے بھی خاص طور پر نوٹ کیا ہے ۔ بلکہ میں تو ان کے روحانی انقلاب کو ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا ۔

مخلص ، محمد اقبال

مکرم بندہ تسلیم !

نوازش نامہ ابھی ملا ۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جناب کی والدہ صاحبہ قبلہ کی صحت اچھی ہے ۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایک دو روز تک ہمارے عزلت کدہ میں وہ کیفیت تھی کہ جس کو غالب نے شاید ہماری محبت کے بارے میں موزوں کیا ہو گا ۔ "لے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" سے آغاز کیا اور "اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے" پر اختتام کیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عجیب قسم کی فرضی کامیڈی

کا ٹریجڈی پر مبنی انجام ہے۔ جس ڈرامے کی ایکٹنگ ہم آپ جیسے انسان انجام دے رہے ہیں اس کے ڈائرکٹر کی انسان نوازی پر فخر کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنے ڈرامے کی شوٹنگ کے لئے انسان کو مختص فرمایا۔ دنیا میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ دونوں بے معنی لفظ ہیں اور اسی دھن میں دنیا کی اکثریت مبتلا ہے۔

انسان صرف جویائے محبت اور اپنے یار حقیقی کی دھن میں لگا رہے۔ باقی تمام عبث اور خیالی دنیا کا بیہودہ فلسفہ ہے۔ ہم اس کو ڈھونڈتے رہیں جو ہم کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اس کو ڈھونڈیں خوب ڈھونڈیں اور اتنا ڈھونڈیں کہ اپنے آپ کو پالیں۔ آپکی چند ساعت صحبت میں میرے دل کو سرور حاصل ہوا۔ آپ درحقیقت مسرت فروش ہیں۔ خدا آپ کو ہر طرح بامراد اور کامیاب رکھے۔ میری صحت خراب ہو رہی ہے۔ بینائی میں فرق آگیا ہے، اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ پرہیز کا میں قائل نہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ امتحان کا وقت قریب آگیا۔ تقرب نصیب ہو رہا ہے، ہم آغوشی بھی مل جائے گی ــــ انشاء اللہ۔ اپنی والدہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں میری جانب سے قدم بوسی عرض کیجئے۔

مخلص، محمد اقبال

۲۰ مئی ۱۹۳۷ء

لاہور، ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء

ڈیر مسعود! کل خط لکھ چکا ہوں۔ آج اس تمام معاملے پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں۔ آپ اس خط کو کانفیڈنشل تصور فرمائیں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے

بھوپال میں آپ کے بیڈ روم میں گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کر لینے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ کر دیا ہو گا۔ اس کے بعد جس ہسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا، میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لئے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی اسراف زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہو گا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں، اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور میں بے حد تذبذب کی حالت میں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی ہز ہائی نس آغا خان سے کیا خط و کتابت ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری اس تحریر کو ناشکری پر محمول نہ کیا جائے۔ بہرحال میں نے ہز ہائی نس آغا خان کو شکریہ کا خط لکھ دیا ہے۔ گو اس میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مطلق نہیں کیا گیا، اور اخلاقاً مجھ کو ایسا کرنے کی جرأت بھی نہ ہونی چاہئے تھی۔ آپ جب اس معاملے پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے بہت پہلو ہیں اور میں نے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر آپ کو یہ خط لکھا ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھ کو جلد اس امر سے اطلاع دیں کہ آیا آپ کو میرے ان خیالات سے اتفاق ہے یا نہیں۔ اگر اتفاق نہیں ہے اور اب اس تجویز کا ڈراپ کرنا قرین مصلحت نہیں ہے تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں، اور وہ یہ کہ ہز ہائی نس آغا خان یہ پنشن جاوید کو عطا کر دیں، اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم

ہو جائے یا جس وقت تک ہز ہائی نس صاحب مناسب تصور کریں بعض پرائیویٹ وجوہ کی بنا پر، جن کا کچھ نہ کچھ حال آپ کو بھی معلوم ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسکی تعلیم کی طرف سے بکلی اطمینان ہو جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہز ہائی نس آغا خاں میری اس تجویز کی نسبت کیا خیال کریں گے۔ میں نے اپنی مشکلات کا حال آپ کو لکھ دیا ہے۔ اب آپ جو تجویز چاہیں کریں اور مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کریں، جہاں تک ممکن ہو جلد۔ آخری فیصلے تک اس بات کا پریس میں جانا مناسب نہیں ہے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

محمد اقبال، لاہور

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اپنے نجی خطوں میں اس بات کا اظہار ضرور کرتے تھے کہ انھیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے گہری دلچسپی ہے۔ وہ شعر شاعری اور ادبی مسائل پر اظہارِ خیال بھی کرتے تھے اور علمی اعتبار سے استفادے کا خیال ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ ان کے اندازِ نگارش میں سادگی اور روانی تھی اور وہ آسان اور سادہ زبان میں علمی اور فلسفیانہ مسائل تک کو پیش کرنے پر قادر تھے۔ ایسے مواقع پر ادبیت ان کے اندازِ نثر میں پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن ان کی تحریر کی سادگی اور روانی اس کو موثر ضرور بنا دیتی تھی۔

۴

اقبال نامہ

(یعنی مجموعۂ مکاتیبِ اقبال، حصہ دوم)

مکاتیب اقبال کی یہ دوسری جلد ہے جو اقبال نامہ (حصہ دوم) کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ شیخ عطاء اللہ صاحب ہی نے اس جلد کو بھی مرتب کیا ہے اور شیخ محمد اشرف نے لاہور سے شائع کیا ہے۔

"اقبال نامہ" کی اس جلد میں بھی علامہ کے بعض بہت ہی اہم خطوط ہیں جو انھوں نے حضرت اکبر الہ آبادی، قائداعظم محمد علی جناح، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، عطیہ فیضی، پروفیسر شریف، راغب احسن، محمد دین فوق، خواجہ حسن نظامی، خاں نیاز الدین خاں، سید نذیر نیازی اور بعض دوسرے ہم عصروں کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوط میں علامہ کے سیاسی خیالات، تہذیبی و ثقافتی نظریات اور علمی تصورات پوری طرح اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں۔

شیخ عطاء اللہ صاحب ان خطوط کے متعلق اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

مکاتیبِ اقبال، کی فراہمی کا کام، یادش بخیر، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں شروع ہوا اور جلد اول، جس میں ۲۶۷ خطوط ہیں، ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت سے مقصود یہ تھا کہ مکاتیب کی مزید فراہمی میں سہولت پیدا ہو۔ چنانچہ ایک حد تک ایسا ہوا بھی لیکن جنگ نے ہر طرح کی مشکلات کو دوبالا کر دیا۔ جنگ کے خاتمے پہ ملک میں فسادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد آزادی کے جلو میں آنے والے ہنگامۂ رستخیز میں دوسری کتنی قیمتی یادگاروں کے ساتھ اقبال کے مکاتیب کے وہ ذخیرے، جن پر میری نظر تھی، بظاہر ہمیشہ کے لئے

ضائع ہو گئے، اور کتنے ہی نادر ذخیرے، جن کا ہمیں علم نہ تھا اور جو اپنے وقت پر کسی نہ کسی طریق سے ضرور ظاہر ہوتے، اب بظاہر تلف ہو چکے ہیں۔ اس لئے جو کچھ ہو سکا وہ موجب مسرت ہے، جو کچھ رہ گیا وہ موجبِ صد ہزار حسرت۔ جو خطوط حاصل ہو سکے، بلا کم و کاست شاملِ مجموعہ کر لئے گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق و جستجو کے مطابق ان میں اپنی تسکین کا سامان مہیا پائے گا۔" (ص ۲)

اس مجموعے کے چند خطوط نمونے کے طور پر آئندہ صفحات میں درج کئے جاتے ہیں:

"لاہور، ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ سید صاحب۔ السلام علیکم۔

کل ظفر علی خاں صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی۔ اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ ملا۔ دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے، تاکہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دِل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں "جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے" سو یہی حال میرا

لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبع سلیم میرے لئے شکنجے کا کام دے گئی۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفی :

رستم نہ مدعی بہ قبولِ غلط ولے
در تابم از شکنجۂ طبعِ سلیم خویش

ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے۔ مجھے یہ سُن کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔ "غزوۂ شوال" پر چند اشعار لکھے تھے۔ "زمیندار" اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے۔ ان کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ترکی داٹلی کی جنگ نے ان کی تصدیق کر دی ہے۔ اگر "زمیندار" اخبار آپ تک نہ پہونچا ہو تو تحریر فرمائیے، بھجوا دوں گا۔

خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے۔ مجھے بھی ان سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضۂ رسول نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے، دیکھئے کب جوان ہوتی ہے۔ شیخ عبدالقادر لائل پور میں سرکاری وکیل ہو گئے۔ اب وہ لاہور سے وہاں چلے گئے۔ کچھ دن ہوئے یہاں آئے تھے مگر میں ان سے نہ مل سکا۔ آرڈر قائم کرنے کا خیال تھا اور اب تک ہے، مگر اس راہ میں مشکلات بعید ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مذاق کے لوگ کہاں ہیں۔ بہرحال میں ہم خیال پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ آپ دعا کریں۔

خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔ مجھے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا آپ کو

صحت کامل کرامت فرمائے۔

دُعاگو، محمد اقبال بیرسٹر، لاہور

لاہور، ۹ نومبر ۱۹۱۱ء

مخدومی! السلام علیکم

آپ کے دونوں نوازش نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ الحمدللہ کہ جناب خیریت سے ہیں۔

ترکوں کی فتح کا مژدہ جاں فزا پہنچا، مسرت ہوئی، مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں، گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدم دیرینہ نہیں۔ نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں۔ قومی جلسوں سے بھی پہلوتہی کرتا ہوں۔ ہاں آپ کے خطوط، جو میرے پاس سب محفوظ ہیں، بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کیا ہے کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجئے مگر میں خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں۔ یہ ایک قسم کی روحانی خود غرضی ہوگی جس کا ارتکاب میرے نزدیک گناہ ہے۔ آپ کی ملاقات کے لئے دل تڑپ رہا ہے۔ خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے۔ کیا آپ دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے؟

"زمیندار" میں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ "اردو شاہنامہ" تلف ہو گیا جو شعر اس میں سے شائع ہوئے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں:

رگِ موج سے خون جاری کریں

اس مصرع پر تو فردوسی اور نظامی بھی رشک کرتے۔ ہاشم تال عمرہ کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجئے۔ میری روح کو اس نام سے ایک خاص تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کی عمر دراز کرے اور دین و دنیا میں اسے بامراد کرے۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہوگا، مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیران مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے۔ یہی نظر صبغۃ اللہ ہے واحسن فی صبغۃ اللہ۔

اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیران مشرق دنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے۔ میاں ہاشم! اب وقت ہے، اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیر مشرق سے لے سکتے ہو، لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آنے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمھاری روح لذت اٹھائے گی

خادم محمد اقبال، لاہور"

۵

مکتوبات اقبال

"مکتوبات اقبال" حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے ان خطوط کا مجموعہ ہے [جو و]قتاً فوقتاً اس کے مرتب (سید نذیر نیازی صاحب) کے نام لکھے گئے۔ اس مجموعے [کو] نذیر نیازی صاحب نے ممتاز حسن کے اصرار پہ مرتب کیا ہے۔ چنانچہ تمہید میں [نیاز]ی صاحب لکھتے ہیں:

"مکتوباتِ اقبال کا یہ نسخہ اپنے عزیز دوست اور کرم فرما جناب ممتاز حسن صاحب کے اصرار پر مرتب کر رہا ہوں جیساکہ آئندہ صفحات میں عرض کر دیا گیا ہے، حضرتِ علامہ سے باقاعدہ خط و کتابت کا آغاز ۱۹۲۹ء میں ہوا ابتداء میں 'پیامِ مشرق' کی طباعت اس کا سبب بنی، پھر انگریزی خطبات 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' کے اردو ترجمے نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔ یہ آج سے چھبیس ستائیس برس پہلے کی بات ہے جب میں دہلی میں مقیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حلقۂ اساتذہ میں شامل تھا"۔ [1]

(مکتوباتِ اقبال)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں علامہ اقبال کے بعض نہایت ہی اہم خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط کی ترتیب کے بارے میں نیازی صاحب نے لکھا ہے

"رہی ان کی ترتیب، سو راقم الحروف کا خیال تھا کہ مکتوبات کو محض سنینی اعتبار سے تاریخ وار مرتب کر دینا کافی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ کوئی خط بھی ہو، اس کا کچھ حصہ واضح ہوتا ہے، کچھ غیر واضح۔ لہٰذا میں نے یہی بہتر سمجھا کہ ہر مکتوب کے غیر واضح پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ واضح کر دوں تاکہ اس کا پسِ منظر بھی قارئین کے سامنے آجائے"۔ [2]

چنانچہ اس مجموعے میں نیازی صاحب نے جو تعلیقات اور حواشی لکھے ہیں، وہ نہایت اہم ہیں کیونکہ ان سے علامہ کے ان خطوط کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

چند خطوط کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

---

[1]۔ سید نذیر نیازی: مکتوباتِ اقبال [2]۔ سید نذیر نیازی: مکتوباتِ اقبال۔

لاہور، ۴ اپریل ۱۹۳۰ء

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

انگریزی لیکچر قریباً ۱۵ اپریل تک چھپ کر تیار ہو جائیں گے۔ آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ آیا وہ اردو ترجمہ کرنے کے لئے لاہور آسکیں گے یا نہیں۔ اگر وہ نہ آسکتے ہوں تو آپ خود یہ کام کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ ترجمہ بلا معاوضہ نہ ہوگا۔

ایک صاحب امیر شاہی نے، جو غالباً جامعہ ملیہ سے تعلق رکھتے ہیں، 'گلشنِ رازِ جدید' کی شرح کے لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ میں نے ان کو اجازت بھی دے دی تھی۔ اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ چونکہ ایک صاحب لاہور میں بھی اس کام کے لئے آمادہ ہیں اس واسطے ان سے دریافت کر کے مجھے مطلع کریں۔

مولانا شوکت علی اس وقت دہلی میں ہیں۔ میں نے ان کو بمبئی کے پتے پر ایک خط لکھا تھا، معلوم نہیں ان تک پہنچا یا نہ پہنچا۔ اگر پہنچا ہے تو اب تک جواب کیوں نہیں ملا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ عابد صاحب سے سلام کہئے۔ والسلام[1]

محمد اقبال

لاہور، یکم جون

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ ترجمے کا خیال بدستور ہے، بلکہ بعض احباب کی طرف سے تقاضا ہے کہ جلد کیا جائے، گو مجھے اس پر شبہ ہے کہ عام لوگ اس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ علماء، جنھوں نے فلسفے کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، وہ میرا مقصد سمجھ

---

[1] سید نذیر نیازی: مکتوباتِ اقبال، ص ۲۲۔

سکیں گے۔ بہرحال جب آپ لاہور آئیں تو نمونے کے طور پر کچھ حصہ اس کا ترجمہ کریں تاکہ معلوم ہو کہ کہاں تک اس کوشش میں کامیابی ہو سکے گی۔ والسلام[1]

محمد اقبال، لاہور

"ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ "کتاب الطواسین" بذریعہ ڈاک لکھنؤ سے آگئی ہے، جلسہ لیگ ملتوی ہو گیا ہے، اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہو گا۔ غالباً لکھنؤ میں۔ یہ بھی ممکن ہے کسی اور جگہ ہو۔ لکھنؤ پنجاب والوں کے لئے ذرا دور ہے۔ بہت سے لوگ جانے تیار تھے مگر اخراجات سے گھبراتے تھے۔ عابد حسین صاحب سے کہہ دیجئے کہ مناسب ترمیم کے بعد بل بھجوا دیں۔ میں روپے بھجوا دوں گا۔ سورتی صاحب سے ضرور مل لیجئے وہ آپ کو تراجم کے متعلق (بالخصوص اصطلاحات کے تراجم کے متعلق) بہت مفید مشورہ دیں گے۔ عابد صاحب سے یہ بھی پوچھئے کہ فاوسٹ مین PRELEGOMENA IN HEAREN کا کیا اردو ترجمہ انھوں نے کیا ہے؟ والسلام[2]

محمد اقبال

لاہور، ۱۴ اگست ۱۹۳۰ء

---

۹ دسمبر ۱۹۳۰ء

ڈیر نیازی صاحب۔ السلام علیکم

آپ بک ڈپو کے منیجر صاحب کو یاد دلائیں کہ وہ ۳۹-۹ روپے کے چک کی رسید

[1] سید نذیر نیازی: مکتوبات اقبال، ص ۲۴۔ [2] ایضاً ص ۳۰۔

ارسال کریں جو میرے کلرک نے کئی دن ہوئے ان کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ ان کو لکھا گیا تھا کہ باقی روپیہ (۷۵/-) چک کے وصول کی رسید آنے پر بھیج دیا جائے گا، مگر ان کی طرف سے کوئی رسید اس وقت تک وصول نہیں ہوئی۔ چک رجسٹری شدہ خط میں بند تھا۔ کلرک کو بھی تردد ہو رہا ہے رسید آنے پر باقی روپیہ ارسال ہوگا۔

مولانا اسلم کا ارشاد بجا ہے۔ اس آیت کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے اس مضمون کی آیات قریباً تمام کتب سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ خدا مادی معنوں میں نور ہے LIGHT DEALT WITH IN PHYSICAL SCIENCE نور محض ایک استعارہ ہے جیسے قدیم کتب سماوی میں PANTHEISTIC اغراض کے لئے استعمال کیا گیا تھا، یعنی وجود باری کو ہمہ گیر PERVASIVE ظاہر کرنے کے لئے۔ قرآن نے میری رائے ناقص میں اس قدیم استعارے کو وجود باری کی ABSOLUTENESS پر اشارہ کرنے کے لئے استعمال کیا ہے کیونکہ عالم مادی بھی زمانۂ حال کی تحقیق کی رو سے صرف نور ہی ایک ایسی چیز ہے جو RELATIVELY ABSOLUTE ہے۔ مقدمہ وغیرہ کا انتظام ابھی سے کر لیجئے۔ غالباً بنارس جاؤں گا۔ والسلام[1]

محمد اقبال"

---

[1] سید نذیر نیازی، کتاب مذکور، ص ۸۴۔

۶

مکاتیب اقبال

بنامِ گرامی

"مکاتیب اقبال" ان خطوط کا مجموعہ ہے جو علامہ اقبال نے مولانا گرامی کو لکھے۔ یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کے پیش لفظ، جناب غلام رسول مہر صاحب کی تمہید و تعارف اور محمد عبداللہ قریشی صاحب کے مقدمہ مرتب کے ساتھ اقبال اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئی۔

ممتاز حسن صاحب اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"گرامی سے اقبال کی خط و کتابت زیادہ تر علمی اور ادبی نوعیت کی ہے اور اکثر ان کے اپنے کلام کے فنی پہلوؤں کے متعلق ہے۔ حسنِ فن ہی اقبال اور گرامی میں ایک قدرِ مشترک ہے ورنہ خیالات اور موضوعات کے اعتبار سے دونوں کی دنیا الگ الگ ہے۔ گرامی روایتی حسن و عشق کے استادانہ شاعر ہیں اور اقبال یہ چاہتے ہیں کہ انسان:

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال اکاڈمی کو ایک عرصے سے گرامی کے نام اقبال کے خطوط کی تلاش تھی۔ ہم جناب شیخ سردار محمد صاحب کے ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے یہ نادر خطوط اکاڈمی تک پہونچے۔ شیخ صاحب نے نہ صرف یہ خطوط مہیا کئے بلکہ گرامی کے چند جوابی خطوط کی نقلیں بھی فراہم کیں جو خود گرامی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں! اب یہ ذخیرہ جو اقبالیات میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے، آپ کے سامنے

ہے۔ ان خطوط کو جناب عبداللہ قریشی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے اور مختلف خطوط پر جا بجا حواشی اور تعلیقات بھی تحریر کئے ہیں جس محنت اور تحقیق سے انھوں نے یہ کام سرانجام دیا ہے، وہ قابل قدر ہے۔[1]

مولانا مہر نے ان خطوط کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے :

" مولانا گرامی مرحوم کے نام مکاتیبِ اقبال کا یہ مجموعہ اس اعتبار سے تو بیش بہا نعمت ہے ہی کہ اقبال کی تحریرات ہیں جن کا ایک ایک حرف چشم بصیرت کے لئے کحل الجواہر ہے لیکن ان کی بیش بہائی کا ایک خاص پہلو بھی ہے یعنی یہ مکاتیب اس خوش ذوق اور خوش فکر شاعر کے نام ہیں جو اپنے دور میں کلاسیکی فارسی شاعری کے کامل الفن اور فن شناسوں میں سے بلند مرتبے پر فائز تھا۔ ان مکاتیب میں اقبال کی شاعرانہ حیثیت کے جو گوشے بے نقاب ہوئے ہیں وہ غالباً کسی دوسرے مکتوب الیہ کے ساتھ مکاتبت میں واضح نہیں ہوئے، اور نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ دوسرے مکتوب الیہم میں سے بیشتر تو شاعر تھے ہی نہیں اور جو تھے ان کا ذوق شعر گرامی کے برابر نہ تھا۔"[2]

اقبال کے یہ خطوط بے تکلفی کے ساتھ ایک بے تکلف دوست کو لکھے گئے ہیں۔ ان میں علمی ادبی باتیں بھی ہیں لیکن ساتھ ہی زندگی کے لطیف پہلوؤں کا ذکر بھی خاصا ہے۔ علامہ اقبال کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاج کی شادابی ان خطوط میں جگہ جگہ اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ چند خطوط سے ان خصوصیات کا اندازہ ہوگا :

" لاہور، ۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

مخدومی جناب مولانا مولوی گرامی صاحب !

۱۔ ڈاکٹر ممتاز حسن: دیباچہ مکاتیب اقبال۔
۲۔ مولانا غلام رسول مہر: تمہید و تعارف مکاتیبِ اقبال۔ ص ۲۔

آپ کا تخلص گرامی کی جگہ "نومی" ہونا چاہیئے کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ راون لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔ حیدرآباد کی شاہی میں تبدیلی ہوئی، وزارت بدل گئی مگر آپ ابھی اونگھ رہے ہیں۔ برائے خدا کبھی اپنی خیریت سے مطلع کیا کرو۔ آپ کے بہت سے لاہوری دوست استفسار حال کرتے ہیں تو مجھے یہی جواب دینا پڑتا ہے کہ مولانا گرامی آرام میں ہیں۔ اکثر تو یہ کہتے ہیں کہ ان کو خط لکھ کے جگا دیئے مگر اس کے لئے شورِ محشر کی ضرورت ہے، خطوں سے کیا ہوتا ہے۔ کب تک لاہور آنے کا قصد ہے؟ ہم نام اقبال سلام قبول کریں۔ نیز ان سے یہ درخواست ہے کہ مولوی گرامی یعنی "شیخ نامی" سے جس طرح بن پڑے خط لکھوائیں۔ والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال، از لاہور[1]

لاہور، ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء

جناب مولانا گرامی!

آپ کہاں ہیں؟ حیدرآباد ہیں یا عدم آباد ہیں؟ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجئے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ مدیاں گذر گئیں کیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے میں تو اب بوجہ مشاغل منصبہ کے تارک الشعر ہوں۔ ہاں کبھی فرصت ملتی ہے تو فارسی اساتذہ کے اشعار پڑھ کر مزا اٹھا لیتا ہوں۔ میری شاعری گھٹ کر اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ اوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گذشتہ

---

(۱) مکاتیب اقبال، ص ۹۶

سال ایک مثنوی فارسی میں لکھنی شروع کی تھی، ہنوز ختم نہیں ہوئی اور اس کے اختتام کی امید بھی نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے مشرقی اور مغربی لٹریچر میں یہ مثنوی بالکل نئی ہے، لیکن آپ سے ملاقات ہو تو آپ کو اس کے اشعار سناؤں۔ مجھے یقین ہے آپ اسے سن کر خوش ہوں گے۔ کہئے ادھر آنے کا کب تک قصد ہے؟ میں ایک عرصے سے آپ کا منتظر ہوں خدارا جلد آیئے۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ آکر میری مثنوی سنئے اور اس میں مشورہ دیجئے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

امید ہے کہ بابا گرامی اچھا ہوگا اور نئے نکاح کی فکر میں اپنے آپ کو نہ گھلاتا ہوگا۔ گھر میں میری طرف سے سلام کہہ دیجئے۔

خط کا جواب جلد لکھئے اور نیز یہ کہ اپنے اشعار بھی بھیجئے۔ میری مراد تازہ افکار سے ہے[1]

آپ کا خادم محمد اقبال، لاہور"

"لاہور، ۲۸ جنوری ۱۹۱۵

ڈیر مولانا گرامی۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا، غزل پڑھ کر نہایت مسرت ہوئی:

بدست عقل دہند از شکست تو یہ کلید

نے پہروں بے قرار رکھا اور "تمام خندہ بگریم" سبحان اللہ! آج ہندوستان میں کون ہے جو یہ تبرک لکھ سکتا ہے۔ "ز دیدہ تا در دل ذرہ ذرہ غماز است"

---

[1] مکاتیب اقبال: ص ۹۸

میں نے یہ شعر مولانا اکبر کو الہ آباد لکھ کر بھیجا تھا۔ کل ان کا خط آیا۔ اس شعر نے انھیں بھی تڑپادیا۔ غرض کہ گرامی سحر نگار، ہندوستان کے لیے سرمایۂ ناز ہے اور آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا۔ زندہ باش اے پیرکہن! ہاں چند اشعار اور لکھتا ہوں۔ اس خیال سے نہیں کہ اپنے اشعار سناؤں بلکہ اس خیال سے کہ شاید آپ کو تحریک ہو اور آپ سے نئے اشعار سنوں:

خوش آنکہ رخت خرد را بشعلۂ مے سوخت
مثال لالہ متاعے ز آتشے اندوخت

دلم تپید ز محرومیِ فقیہِ حرم
کہ پیرِ میکدہ جامے بفتوئی نفروخت

متنبج قدر سرود از نوائے بے اثرم
ز برق نغمہ تواں حاصل سکندر سوخت

تو ہم ز ساغرِ مے چہرہ را گلستاں کن
بہار خرقہ فروشی بہ صوفیاں آموخت

عجب مدار ز سرمستیم کہ پیرِ مغاں
قبائیِ رندیِ حافظ بہ قامتِ من دوخت

صبا بہ مولد حافظ سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

میں نے یہ اشعار مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کو لکھے تھے کیونکہ وہ رسالہ "تزک عثمانیہ" میں انھیں شائع کرنا چاہتے تھے۔

ہاں! آپ نے یہ نہ فرمایا کہ قدرت کیا سامان پیدا کر رہی ہے۔ مجھے تو بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ خدائی کارخانے کا حال معلوم نہیں۔

حیدری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں اور نہایت با مذاق۔ آپ ان سے ضرور ملا کریں۔ شیخ غلام محی الدین صاحب ملیں تو میرا اسلام ان سے کہئے۔ اخباروں میں کبھی کبھی یہ خبر شائع ہو جایا کرتی ہے کہ سید علی امام وزیر حیدرآباد ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضور نظام نے جو حال میں ملاقات وائسرائے سے کی ہے اس کا مقصد وزارت کے متعلق گفتگو کرنا تھا۔ کیا آپ کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد پھر مدارالمہام ہو جائیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اپنی خیریت سے آگاہ فرمایئے اور خط کا جواب مع اشعار جلد مرحمت فرمایئے۔ آپ کب تک پنجاب آنے کا قصد کرتے ہیں؟ آپ کے مشتاق منتظر ہیں [1]

والسلام

محمد اقبال، لاہور"

"لاہور، ۳ جولائی ۱۹۱۷ء

ڈیر مولانا گرامی۔ السلام علیکم

آپ بھی کہیں گے کہ اس نے خطوں کا تانتا ہی باندھ دیا۔ میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ اس فکر میں ہوں کہ حضرت سیدہ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے جو معانی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی وہ شعر ذہن میں آیا۔ ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے۔ عرض کرتا ہوں:

---

[1]۔ مکاتیب اقبال، ص ۱۰۱

گریۂ شب ہائے آں بالا نشیں
ہم چو شبنم ریخت بر عرش بریں

اس شعر کو بہ نظر غور ملاحظہ فرمائیے۔ "بالا نشیں" "ریختن" کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے مگر کسی قدر کھٹکتا بھی ہے۔
اب آپ جانیں اور آپ کا کام، میں نے مضمون پیدا کر دیا۔ باقی خیریت ہے۔ میرے خطوط کے جواب دیجئے اور یہ بھی لکھئے کہ لاہور آنے کا کب تک قصد ہے۔ والسلام!

مخلص محمد اقبال، لاہور[1]

لاہور، ۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء

ڈیر مولانا گرامی۔ السلام علیکم

کل آپ کو خط لکھنے بیٹھا، پھر کسی اور کام میں مصروف ہو گیا جو بہت ضروری تھا۔ مگر دل کو دل سے راہ ہے، آج آپ کا پیغام ایک نوجوان لے کر آیا۔ وہ ابھی اٹھ کر گیا ہے اور میں آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ میں شملہ سے آتا ہوا بیمار ہو گیا تھا مگر اب خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ سردی آ رہی ہے۔ میں نے مکان بھی تبدیل کر لیا ہے۔ مرزا جلال الدین صاحب کے قریب ہے۔ ایک کوٹھی ایک سو ستر روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لی ہے۔ اب آپ تشریف لائیں گے تو آپ کو زیادہ آسائش رہے گی۔ اب کے ضرور تشریف لائیے۔ کیا ہوشیارپور میں اکیلے بیٹھے ہو! نہ آپ کا وہاں کوئی قدردان، نہ آپ کے مطالبِ عالیہ کو سمجھنے والا۔ نظیری کی غزل پر ایک اور غزل لکھی تھی جس کا آخری شعر لکھتا ہوں۔ آپ لاہور تشریف لائیں گے تو ساری غزل عرض کروں گا۔

---

[1] مکاتیب اقبال، ص ۱۲۷

چنگ تیموری شکست آہنگ تیموری بجاست
سر برون می آرد از سازے سمرقندے دگر

باقی خدا کا فضل و کرم ہے۔ گھر میں میری طرف سے آداب کہہ دیجئے گا۔
مصطفیٰ کمال پاشا کے فتوحات کا مادۂ تاریخ یہ ہے

شاخ ابراہیم را نم مصطفیٰ
سالِ فتحش اسمِ اعظم مصطفیٰ[1]

۱۳۴۱ھ

محمد اقبال"

۷

انوارِ اقبال

"انوارِ اقبال" علامہ اقبال کی تقاریر، خطوط، مضامین اور نادر کلام کا مجموعہ ہے جس کو بشیر احمد ڈار صاحب نے مرتب کیا ہے اور اقبال اکیڈمی کراچی نے مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کا 'پیش لفظ' بھی شامل ہے۔ وہ اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقبال کے اردو مضامین اور مقالات کے بھی دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ "مضامینِ اقبال" مرتبہ تصدق حسین تاج تھا جو ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد دکن سے چھپا اور دوسرا "مقالاتِ اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد معینی ہے جو ۱۹۶۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

نئی تحریروں کے علاوہ اقبال کا کافی کلام ایسا موجود ہے جو ان کے معروف

[1]. مکاتیب اقبال، ص ۲۲۱۔

مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے یا ترمیم یافتہ صورت میں شامل ہے۔
ان کے منتشر اور غیر مدون کلام کے بھی بعد میں کئی مجموعے شامل ہوئے ہیں
جن میں "باقیات اقبال" اور "رودنگار فقیر" جلد دوم قابلِ ذکر ہیں۔
اقبال اکاڈمی کا موجودہ مجموعہ صرف اُن خطوط، مضامین، تقاریظ اور اشعار پر
مشتمل ہے جو یا تو سرے سے کہیں شائع ہوئے ہی نہیں یا اگر شائع ہوئے بھی
ہیں تو کسی باقاعدہ مجموعے میں شامل نہیں۔
خطوط، مضامین، تقاریظ اور منظومات وغیرہ کے علاوہ اس کتاب میں چند
نادر دستاویزات کے عکس بھی شامل ہیں؛ مثلاً اقبال کے اپنے ہاتھ سے لکھے
ہوئے اشعار اور تحریریں، پنجاب اسمبلی کے انتخابات کے دوران کی ایک
یادداشت، مسئلۂ نبوت پر تشریحی مکتوبات وغیرہ، یہ نوادر پہلی مرتبہ شائع
کئے جا رہے ہیں"۔

ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب کے اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال
کے اس مجموعے میں وہ تحریریں شامل ہیں جو اس سے قبل شائع نہیں ہوئیں چند خطوط
یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی کیا اہمیت ہے:

"لاہور، ۲۶ جنوری ۱۹۱۷ء

مخدومی جناب خواجہ صاحب۔ السلام علیکم
میں آپ کے اندازِ بیان کا عاشق ہوں اور مجھی پر کیا موقوف ہے، ہندوستانی
دنیا میں کوئی دل ایسا نہیں جس کو آپ کے اعجاز نے مسخر نہ کر لیا ہو۔
پیش پا افتادہ چیزوں میں اخلاقی اور روحانی اسرار دیکھنا اور اس کے
ذریعے انسان کے عمیق مگر خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنا آپ کے کمال کا
خاص جوہر ہے۔ اگر مجھ کو یقین ہوتا کہ ایسا اندازِ تحریر کوشش سے حاصل

ہو سکتا ہے تو قافیہ پیمائی چھوڑ کر آپ کے مقلدین میں شامل ہو جاتا۔ اُردو لکھنے والوں میں آپ کی روش سب سے نرالی ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ نثر اُردو کے آئندہ مورخین آپ کی ادبی خدمات کا خاص طور پر اعتراف کریں گے۔

رسالہ "بیوی کی تعلیم" جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت دلچسپ اور مفید ہے، خصوصاً دمڑی والے سبق نے تو مجھے ہنسایا بھی اور رلایا بھی۔

باقی سبق بھی نہایت اچھے اور کارآمد ہیں اور عام تمدنی، سیاسی و مذہبی مسائل کو سلجھانے کے لئے خط و کتابت کا طریق بھی نہایت موزوں ہے۔ لڑکیوں کو اس سے بےحد فائدہ پہونچے گا۔

میں نے بھی یہ رسالہ گھر میں پڑھنے کے لئے دیدیا ہے۔ مسلمان لڑکیوں کو خواجہ یانو کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ ان کی تحریک سے ایسا مفید رسالہ لکھا گیا۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

مخدوم و مکرم جناب مولوی کرم الٰہی صاحب السلام علیکم۔

میں نے آپ کی کتاب "اسلامی تاریخ عہد افغانیہ" شروع سے لے کر آخر تک پڑھی۔ یہ کتاب نہایت برمحل لکھی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلم اس کی بہت قدر کریں گے۔ تاریخی تحقیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اکثر مقامات اس کتاب کے قابل داد ہیں اور آپ کی قوت استدلال اور درایت تاریخی کو ثابت کرنے کے علاوہ اس بات پر نہایت قوی حجت ہے کہ ہندوستانی مسلموں میں مذاق تاریخ نویسی اب تک زندہ ہے، اور ابھی قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تاریخ کو غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے واقعات کو مورخانہ نگاہ سے دیکھنے والے لوگ اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

محمد اقبال نثر

مگران کے علاوہ عام پڑھنے والے لوگ، بالخصوص مسلم، جن کی قومی روایات کی یہ کتاب ایک نہایت روشن اور صحیح تصویر ہے اس کتاب کے مطالعے سے اخلاقِ فاضلہ کے وہ گراں قدر اصول سیکھ سکتے ہیں جو ان کی قوم کے مابہ الامتیاز رہے ہیں، اور جن پر عمل کرنے سے حجاز کے صحرانشین تیس ہی سال کے اندر شتربانی سے جہاں بانی تک پہونچ کر اقوام قدیمہ کی تہذیب کے وارث اور تہذیب جدید کے بانی بن گئے۔ تاریخ کا مقصد اگر اخلاقی ہے، اور میرے خیال میں تاریخ کا یہی مقصد ہونا چاہئے، تو آپ کی تصنیف اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے اور ہم بہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے آپ کا شکر گذار ہیں کہ آپ نے یہ کتاب عین ضرورت کے موقع پر لکھ کر اپنی قوم پر احسان کیا۔ قومیت کا احساس، جس کو بالفاظ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیئے، قومی زندگی کے لئے ضروری ہے، اور جن وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ بھی قومی حیات کے لئے ضروریات میں سے ہیں۔ پس اس اعتبار سے آپ کی کتاب کا مطالعہ ہر مسلم پر واجب ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلم خاندان اس کتاب کے پڑھنے سے مستفیض ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی محنت اور جانکاہی کا اجر دے اور اس کا انعام آپ کو اس مقدس رسولؐ کی بارگاہ سے ملے جس کام سے بنی نوع انسان کی نجات اور جس کے نام سے ہماری قومیت وابستہ ہے۔ والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا، لاہور

لاہور، ۱۱ جنوری ۱۹۱۸ء

مخدومی و مکرم جناب خواجہ صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط کئی دن سے آیا رکھا ہے۔ مجھے مصروفیت رہی، اس وجہ سے جواب نہ

لکھ سکا، معاف کیجئے گا۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میر نیرنگ صاحب نے آپکو خط لکھا ہے جس نے آپ کو "بدگمانی کے گناہ" سے بچا لیا۔ الحمد للہ علی ذالک۔

آپ کو معلوم ہے تقریباً دو سال ہوئے میں نے اُن اعتراف کے جواب میں جو آپ نے مثنوی اسرارِ خودی پر کئے تھے۔ چند مضامین مسائل تصوف پر لکھے تھے جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلہ 'وحدت الوجود' ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے، قرآن سے ثابت نہیں۔ اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق "صحو" ہے، نہ "سکر"۔ آپ ہی کے اخبار "خطیب" میں حضرت صوفی قاری شاہ سلیمان نے ان دونوں مسائل کے متعلق میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ باوجود اس کے مجھے ہمیشہ اس بات کا تعجب رہا کہ آپ اور آپ کے احباب اس اختلاف کی وجہ سے مجھے کیوں دشمنِ تصوف سمجھتے ہیں؟ یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں بلکہ حضرات صوفیہ میں ایک عرصے سے موجود ہے۔ بہرحال جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار 'وکیل' میں کیا تھا ان کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے، گو ان پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں۔ عوام بلکہ خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لئے موزوں ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانا اکبر (الہ آبادی) نے (جن کا میں ادب و احترام کرتا ہوں) مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث پر نہیں لکھی۔ ہاں ذاتی فائدے کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتا ہوں۔ اب جو مولوی ظفر علیخاں صاحب نے اخبار 'ستارۂ صبح' میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو بوجہ ان دیرینہ تعلقات کے، جو میرے اور ان کے درمیان ہیں، اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دلچسپی ہے، بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ 'ستارۂ صبح' کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں

ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہیں نکلی اور نہ
میں نے مولوی صاحب موصوف (ظفر علی خاں) کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی
ہے، بلکہ پرائیویٹ گفتگو میں کئی امور میں میں نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ اس کے
علاوہ میں تو اصولی بحث کو، جیساکہ اوپر عرض کر چکا ہوں، اخباروں کے لئے
موزوں بھی نہیں سمجھتا، چہ جائیکہ کسی اور کو اس کے جاری رکھنے کی تحریک کروں۔
البتہ موجودہ نتائج کے حالات پر لکھنے اور ہمدردانہ لہجے میں ان کے خیالات و
رسوم کی تنقید کرنے سے قوم کو ضرور فائدہ ہوگا۔ اگر مولوی ظفر علی خاں یا آپ
اس طرف توجہ کریں تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ غرض کہ آپ کو میری نسبت
بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اور اگر کسی وجہ سے بدگمانی ہو بھی گئی تھی
تو آپ مجھ سے براہ راست دریافت کر سکتے تھے۔ لوگ تو اس قسم کی باتیں اڑایا
ہی کرتے ہیں۔ دو چار روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ خواجہ حسن
نظامی صاحب نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں
پر رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آئندہ کے لئے توبہ کی ہے۔ میں نے
انھیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے،
اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا، سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کی صحبت کے
ایک لحظے کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے، لیکن جو بات خواجہ
حسن نظامی کی طرف منسوب کرتے ہو تو اس کے لغو ہونے میں کوئی شبہ
نہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ اگر آپ
چاہیں تو یہ خط شائع کر سکتے ہیں۔ والسلام

محمد اقبال، از لاہور

۸

مکاتیبِ اقبال

"مکاتیبِ اقبال علامہ اقبال کے ۹۷ خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط انھوں نے خان محمد نیاز الدین خاں صاحب کے نام لکھے تھے جن کو خاں افتخار الدین احمد خاں اور خان نفیس الدین احمد خاں نے محفوظ رکھا اور بزمِ اقبال نے اُن سے حاصل کرکے ۱۹۵۴ میں شائع کیا۔

یہ خطوط اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں علامہ کے فلسفیانہ خیالات' تصوف کے بارے میں ان کے نظریات، سیاست کے بارے میں ان کے تصوّرات اور انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بارے میں ان کی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خطوط بے تکلفی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ جدّت، اُپج اور بے ساختگی ہے جو اچھے خطوط کے لئے معیار سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمٰن صاحب، جنھوں نے مکاتیب اقبال کا پیش لفظ لکھا ہے، ان کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"اکثر خطوط میں علامہ مرحوم نے کسی نہ کسی اہم علمی یا ادبی موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بڑے بڑے لطیف نکتے بیان کئے ہیں جن سے ان کے نظامِ فکر کی توضیح میں امداد لی جا سکتی ہے۔ اس لئے دِل دادگانِ اقبال کو خان افتخار الدین احمد خاں کا سپاس گذار ہونا چاہئے کہ وہ اپنے والد مرحوم کے اس ادبی اور علمی ورثے کو تقسیم ملک کے بعد، سینے سے لگا کر مشرقی پنجاب کی پُر آشوب فضا سے نکال لائے اور اب اس کی طباعت کا اہتمام بزم اقبال کے سپرد کرکے اقبالیات کے ذخیرے میں ایک بیش بہا اضافہ کر رہے ہیں۔" [۱]

---

[۱] جسٹس ایس۔ اے رحمٰن: پیش لفظ مکاتیبِ اقبال۔

ان چند خطوط سے، جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، علامہ اقبال کے خیالات و نظریات کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور ان کی دلچسپیوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے:

"مخدومی۔ السلام علیکم

والانامہ ملا، مشکور فرمایا۔

میرا تو خیال تھا کہ فرصت کا وقت مثنوی کے دوسرے حصے کو دوں گا جو پہلے سے زیادہ ضروری ہے، مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کردی ہے۔ تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں، یعنی منصور حلاج تک۔ چار پانچ باب اور ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی علامہ ابن جوزی کی کتاب کا وہ حصہ بھی شائع کردوں گا جو انھوں نے تصوف پر لکھا ہے۔ گو ان کی ہر بات میرے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں مگر اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوگا کہ علمائے محدثین اس کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔ ابن جوزی کی کتاب مطبع مجتبائی دہلی سے ملتی ہے مگر اب اس پر روپیہ نہ خرچ کریں، کیونکہ اس کا ضروری حصہ میری تاریخ تصوف کے ساتھ شائع ہو جائے گا۔ میں نے مترجم سے چھاپنے کی اجازت لے لی ہے۔

تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ، جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے، نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفے کا حصہ محض بے کار ہے اور بعض صورتوں میں تو میرے خیال میں تعلیم قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکال غیبی کے مشاہدے (کی) طرف کردی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا، حالانکہ اسلامی نقطۂ خیال سے تزکیۂ نفس کا مقصد محض ازدیادِ یقین و استقامت ہے۔ اخلاقی اور عملی اعتبار سے متصوفین

اسلامیہ کی حکایات و مقولات کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ لیکن دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے سے ہی کھلتی ہے اور آج کل زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے علمی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے۔ حضرات صوفیہ خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوف باطن لیکن اس پر آشوب زمانے میں وہ ظاہر جس کا باطن تصوف ہے، معرض خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت آج بالکل ویسی ہے جیسے کہ اسلامی فتوحات کے وقت ہندوستان کے ہندوؤں کی تھی یا ان فتوحات کے اثر سے ہوگئی۔ ہندو قوم کو اس انقلاب کے زمانے میں منو کی شریعت کی کورانہ تقلید نے موت سے بچا لیا۔ اپنی شریعت کی حفاظت کی وجہ سے ہی یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے ورنہ اگر فیلو (پہلا یہودی متصوف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔

والسلام ـــ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

۱۳ فروری ۱۹۱۶ء خاکسار محمد اقبال، لاہور

مخدومی ـ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ سراج الدین صاحب کے دونوں مضامین، جو آپ کی نظر سے گذرے، بہت اچھے ہیں۔ ان کا تیسرا مضمون خودی اور رہبانیت پر حال میں شائع ہوا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ معلوم ہوتا ہے میرا مضمون 'علم ظاہر و علم باطن' جو 'وکیل' میں شائع ہوا ہے، آپ کی نظر سے نہیں گذرا، اسے بھی پڑھئے۔ ایک اور مضمون لکھ رہا ہوں جو بالکل نرالا

ہے۔ غالباً آج تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا جن علماء نے تصوف وجودیہ کی مخالفت کی ہے ان کی توجہ کبھی اس طرف نہیں ہوئی۔ بہرحال آپ دیکھیں گے تو داد دیں گے۔

ہاں کتابیں نہیں ملتیں، بڑی دقت ہے۔ شیخ روزبہان بقلی کی "شرح شطحیات" ایک عجیب و غریب کتاب ہے، اس میں صوفیائے وجودیہ نے جو خلافِ شرع باتیں کہی ہیں، اس کی شرح ہے۔ اگر یہ رسالہ ہاتھ آجائے تو تصوف کے بہت سے مسائل پر اس سے روشنی پڑے گی، مگر باوجود تلاش کے نہیں دستیاب ہو سکا سُنا ہے کہ لاہرپور (مارواڑ) میں ایک سجادہ ہے۔ یہاں کوئی بزرگ قلندر صاحب گذرے ہیں جنھوں نے محی الدین ابن عربی کی 'فتوحات' کی تردید میں ایک مبسوط کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے جو اب تک ان کے جانشینوں کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے موجودہ سجادہ نشین کی خدمت میں خط لکھوایا ہے۔ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے۔

کپورتھلے اور جالندھر انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔ عجب نہیں کہ ان تعطیلوں میں موقع مل جائے۔ چند روز کے لئے شملہ جاؤں گا، وہاں سے دہلی ہوتے ہوئے جالندھر اور کپورتھلہ کی سیر کا موقع مل سکتا ہے۔ بہرحال یہ قصد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرنے کی توفیق عطا کرے۔ لاہور میں بارش مطلق نہیں ہوئی۔ لوگ تڑپ رہے ہیں۔ تین روزے رکھے تھے کہ درد گردہ کے دورے کی ابتدا محسوس ہوئی۔ دو روز سے روزے سے بھی محروم ہوں۔ والسلام

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

۸ جولائی، ۱۹۱۶ء — آپ کا خادم محمد اقبال، لاہور

مخدومی خان صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔ میرا ارادہ تو شملہ جانے کا تھا۔ نواب ذوالفقار علی خاں سے وعدہ تھا اور ان کے خطوط اب تک بھی آ رہے ہیں۔ مگر بھائی صاحب نے مجھ سے وعدہ لے لیا ہے کہ اگست کا سارا مہینہ سیال کوٹ میں قیام کروں۔ سو میں بمع اہل (و) عیال کے ۲۹ اگست تک وہاں رہا۔ وہاں سے ستمبر شروع ہونے سے پہلے اس واسطے آ گیا کہ اگر مولوی احمد دین وکیل ہمراہ ہو گئے تو ستمبر کا مہینہ کشمیر میں بسر کروں گا، مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے کشمیر چلے گئے ہیں کل منشی سراج الدین میر منشی ریذیڈنسی کا خط آیا ہے کہ چند روز کے لئے چلے آؤ۔ اور نیز یہ کہ چودھری شہاب الدین کو تار دیا ہے کہ وہ تم کو ہمراہ لے کر جلد آئیں۔ چودھری صاحب غالباً ڈلہوزی میں ہیں۔ ان کے انتظار میں ہوں کہ وہ آئیں تو ان کے ہمراہ چند روز وہیں بسر کر آؤں۔ انشاء اللہ جالندھر ضرور حاضر ہوں گا۔ میاں مبارک علی صاحب کا متبنیٰ میرا ٹوکل رہ چکا ہے۔ اگر کتابیں اس کے پاس باقی ہوئیں تو ان کا دیکھنا کچھ مشکل نہیں اور اگر مشکل بھی ہو تو آپ کی موجودگی میں کون سی مشکل ہے جو حل نہ ہو۔

افسوس ہے کہ اگست کے مہینے میں تصوف کی تاریخ پر کچھ نہیں لکھ سکا۔ البتہ مثنوی کے دوسرے حصے کے بہت سے اشعار لکھے گئے، یعنی آدھی مثنوی لکھی گئی کیا عجب کہ باقی بھی جلد تمام ہو جائے۔ پہلے حصے کی دوسری ایڈیشن کا کاغذ کل خرید کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مغربی ہند کے ملاحدہ کی رد اور اصلاح کے لئے مامور کیا تھا اور یہ کام انھوں نے نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ان کی کتاب "تفضیلت الشیخین" بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے آخری حصے میں تصوف پر انھوں نے

خوب بحث کی ہے ۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ کی نسبت یہ فیصلہ کرنا کہ وہ ہمہ ادست یا ہمہ از دست کے قائل تھے ، نہایت مشکل ہے ۔ وہ فلسفی تھے اور دونوں طرفوں کی مشکلات کو خوب سمجھتے تھے ۔ حال کے حکما میں جرمنی کا مشہور فلسفی لاٹسا بالکل دوسرا غزالی ہے یعنی خدا کے سمیع و بصیر ہستی ہونے کا بھی قائل ہے اور ساتھ اس کے اس بات کا بھی قائل ہے کہ وہ ہستی ہر شئے کی عین ہے ۔ میرے نزدیک منطقی اعتبار سے کوئی آدمی ایک ہی وقت میں ان دونوں شقوں کا قائل نہیں ہو سکتا ۔ اسی واسطے لاٹسا کا فلسفہ یورپ میں مقبول نہ ہوا ۔ گو اس کی تعلیم اس قسم کی تھی کہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود دونوں کی طرف میلان رکھنے والی طبائع کے لئے موزوں تھی ۔ مگر میرا مذہب تو یہ ہے کہ یہ سارے مباحث مذہب کا مفہوم غلط سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں مذہب کا مقصود عمل ہے ، نہ (کہ) انسان کے عقلی اور دماغی تقاضاؤں کو پورا کرنا ۔ اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے : وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً ___ اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضاؤں کو پورا کرنا ہو بھی (جیسا کہ ہند کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے) تو زمانۂ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا چاہئے اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنی علمی روایات پر قائم رہ سکے گی ۔" اس دور میں سب مٹ جائیں گے ، ہاں وہ باقی رہ جائے گا جو اپنی راہ پر قائم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے ۔"

۱۱ ستمبر ۱۹۱۶ء خادم محمد اقبال ، لاہور

مخدومی خاں صاحب ۔ السلام علیکم

سیالکوٹ نہ جا سکنے کی وجہ عرض کر چکا ہوں ۔ اب پھر ارادہ کیا ہے ، لیکن امید ہے کہ ارادے کی تکمیل ہو جائے ۔ اس واسطے کہ اکیلا جاؤں گا ۔ اہل و عیال ہمراہ

نہ ہوں گے۔ میرے برادر بزرگوار پشاور سے دس روز کی رخصت پر آئے ہیں۔ آج آئے ملنا ہے۔ ایک ہفتہ یا شاید اس سے بھی (زیادہ) وہاں قیام رہے گا۔ واپس آکر فیصلہ کروں گا کہ جالندھر بھی حاضری ہو سکے گی یا نہیں۔ مولانا گرامی کی خدمت میں عرض کیجئے گا کہ پنشن بند کروانے کا اچھا نسخہ ان لوگوں کو سوجھا۔ انشاء اللہ اب لاہور بلانے کے لئے بھی یہی نسخہ استعمال کیا جائے گا۔ ان کو معلوم ہوگا، سید علی امام وہاں پہونچ گئے ہیں۔ اگر وہ لاہور نہ آئے تو میں انھیں ضرور لکھوں گا کہ گرامی کی پنشن بند کی جائے اور اس کی عرضیوں کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔

آپ کی غزلوں میں مجھے دوسری غزل (خفت است) کا مطلع پسند ہے۔ باقی اشعار پھر لکھئے۔

کبوتروں کے دو جوڑے جو آپ نے بکمال عنایت عطا فرمائے تھے ان میں سے ایک جوڑا بچے نہیں دیتا، انڈے توڑ دیتا ہے، اور دوسرے کبوتروں کے نیچے بھی اس کے انڈے رکھے جائیں تو بچے نہیں نکلتے۔ دوسرے جوڑے نے بچے دیئے، مگر ان میں سے دو، جو بہت اچھا اڑتے تھے، شکاری جانوروں کا شکار ہو گئے، ایک باقی ہے۔ جوڑے میں نر ضعیف اور کمزور ہے، امید نہیں دیر تک زندہ رہے۔ بہتر یہ ہے کہ چند بچوں کے جوڑے بھجوا دیجئے ـــــ اگر ممکن ہو تو ـــــ میں نے لدھیانے بھی لکھا ہے اور شاہجہاں پور سے بھی انشاء اللہ کبوتر آئیں گے۔

آپ کے صاحبزادے نے ذکر کیا تھا کہ فیروزپور میں کوئی شخص ہے جو کبوتروں کو مستقل رنگ دے سکتا ہے اور وہ رنگ ان کے بچوں میں منتقل ہو سکتا ہے۔ مہربانی کر کے صاحبزادے سے دریافت کیجئے کہ اس آدمی کا پتہ کیا ہے۔ کل کرنل سٹیفنسن صاحب (سے) کبوتروں کے رنگوں کے متعلق بہت گفتگو ہوئی۔ انھوں نے چند کتابوں کے نام لکھنے کا وعدہ

کیا ہے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ گرامی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہو۔
۴ ستمبر، ۱۹۱۹ء مخلص محمد اقبال، لاہور

۹
گفتارِ اقبال

"گفتارِ اقبال" علامہ اقبال کی تقاریر، مضامین اور بیانات کا مجموعہ ہے جس کو محمد رفیق افضل صاحب نے مرتب کیا اور ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

محمد رفیق افضل صاحب اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"مجموعہ زیرِ نظر میں جو مواد ترتیب دیا گیا ہے وہ کسی اور مجموعے میں شامل نہ تھا۔ یہ سب کا سب لاہور کے دو روزناموں 'زمیندار' اور 'انقلاب' کی صرف اُن جلدوں سے لیا گیا ہے جو ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ تقاریر، بیانات اور مکاتیب وغیرہ کا یہ مجموعہ تاریخ وار ترتیب دیا گیا ہے سوائے آخری دو رو تذکروں ("علامہ اقبال جنوبی ہند میں" اور "گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال کی مصروفیات") اور ضمیمے کے جن کا مواد بعد میں دستیاب ہوا۔"

یہ مجموعہ اس اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے وہ بیانات اور تقریریں شامل ہیں جو کہیں اور موجود نہیں۔ ان کا اخبارات سے ڈھونڈ نکالنا ایک مشکل کام تھا جس کو فاضل مرتب نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

ان نثری تقریروں سے علامہ اقبال کے خیالات و نظریات کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل چند اقتباسات سے اس کا اندازہ ہوگا:

"مکرم بندہ جناب ایڈیٹر صاحب "زمیندار" ! السلام علیکم
میں نے ابھی ایک اور دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بولشویک خیالات منسوب کئے ہیں۔ چونکہ بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعتِ حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لئے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا

ہے۔ اسلام سرمائے کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو یہ معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ "فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں، اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمائے کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان، جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو

قرآنی تعلیم کے منافی ہو؛"

(محمد اقبال، بیرسٹرایٹ لا، لاہور)

"ہمدم" نے مسلمانوں کو ہمیشہ بے لاگ مشورہ دیا ہے جس کے لئے تمام ملک آپ کا شکرگذار ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کرانے کے لئے دوبارہ کوشش کرنے کی تجویز آپ ہی کی تھی۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض بھی کیا تھا کہ شاید ایسی مفاہمت کا موقع پونا کے سمجھوتے کے بعد آجائے۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بات تھی کہ شاید اکثریت کوئی تجاویز مسلمانوں کے سامنے پیش کرے، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو دہلی میں اس سے پہلے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا تھا۔ بہرحال آپ نے مسٹر محمد علی جناح کا تار پڑھ لیا ہوگا۔ وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ مفاہمت کی تجاویز ہندوؤں کی طرف سے پیش ہونی چاہئیں، خواہ ان کی اساس مخلوط انتخابات کا اصول ہی کیوں نہ ہو۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مطالبات میں، جن کا اعادہ وہ کئی بار کر چکے ہیں، از خود ترمیم کر دیں، اور بالخصوص اصول انتخاب میں موجودہ حالات میں ایسا کرنا انتہا درجے کی سیاسی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کرنے سے مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کا دروازہ کھل جائے گا اور جو اتحادِ خیال انھوں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے ضائع ہو جائے گا۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے تصفئے میں اور کچھ ہو نہ ہو، پنجاب کے اندر مسلمانوں کی اکثریت پانچ یا سات کی زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ صوبہ سرحد کو

آئندہ نظام میں مساوات کا درجہ ملتا ہے۔ سندھ کی علیحدگی کے امکانات بھی قریب تر آگئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جداگانہ انتخاب بھی قائم رہا ہے جو میری ناقص رائے میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے۔ جداگانہ انتخابات کو غیر مشروط طور پر کم از کم حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ منتقل کرلیں۔ چاہیں تو اکثریت میں جذب ہو جائیں اور چاہیں تو کم از کم بعض حصص ملک میں اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخابات سے دست برداری قبول کرلی تو آئندہ کا مورخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لئے حکومت برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا، البتہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دے گا کہ جمہوری نظام میں بحیثیت اقلیت انھوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لی۔

تأسف کا مقام ہے کہ ہمارے بعض لیڈر، جن میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں مسئلہ انتخاب کو محض نمائندگی کا طریقۂ کار تصور کرتے ہیں اور بس۔ جہاں تک میں نے مسلمانانِ ہند کی گذشتہ تاریخ اور ایشیائی اقوام کے موجودہ امیال و عواطف اور مغربی اقوام کی سیاسی ریشہ دوانیوں پر غور کیا ہے، مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ ابھی ایک عرصے تک مسلمانانِ ہند کا مستقبل جداگانہ انتخاب سے وابستہ ہے۔ میرے نزدیک جداگانہ انتخاب قومیت کے مغربی تصور سے بھی (قومیت کا مغربی تخیل ایک رُوحانی بیماری ہے) متناقض نہیں اور اس کے باوجود ہندی اقوام میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ خود یورپ میں بھی اس مقصد کا اب خاتمہ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ مشرقی اقوام یورپ کا اترا ہوا لباس پہن لیں اور انھیں مصائب سے دوچار ہیں جن سے یورپ دوچار

ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ خاص اس امر کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار ذرا تفصیل کے ساتھ کرتا مگر کل شام یورپ جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ اس واسطے ان چند سطور پر کفایت کرتا ہوں مختصراً یہ کہ مفاہمت کی تجاویز کا مسلمانوں کی طرف سے پیش کرانا، خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مطالبات ایک مدت سے سب کو معلوم ہیں، خلوص اور حبِ وطنی کے نیک جذبات کا ثبوت نہیں۔ بلکہ ایک سیاسی حیلہ ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ اکثریت، جس کا فرض ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرے، ابھی اس کے لئے تیار نہیں۔ موجودہ حالات میں فرقہ دار مسائل کی بحث کو از سر نو چھیڑنا نہ مسلمانوں کی خدمت ہے، نہ ملک کی۔ زیادہ کیا عرض کروں۔"

مخلص محمد اقبال

۱۰

نوادرِ اقبال

(اقبال کے پچاس خطوط کا مجموعہ)

علامہ اقبال کے یہ پچاس نادر خطوط مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کے نام ہیں جن کو محمد عبداللہ قریشی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ یہ خطوط رسالہ "صحیفہ" کے "اقبال نمبر" حصہ اول، شمارہ ۶۵ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ شروع میں محمد عبداللہ قریشی صاحب نے ان خطوط کی اہمیت واضح کی ہے اور مہاراجہ سر کشن پرشاد اور علامہ اقبال کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے

اس سے قبل ڈاکٹر محی الدین قادری زور صاحب نے "شاد اقبال" کے نام سے علامہ اقبال کے چند خطوط کا ایک مجموعہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا تھا جو اب تقریباً نایاب ہے۔ لیکن اس مجموعے میں بھی زیادہ خطوط نہیں تھے۔ یہ خطوط جن کو محمد عبداللہ قریشی صاحب نے

مرتب کیا ہے، تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور اپنے مضامین کے اعتبار سے اہمیت بھی رکھتے ہیں۔

مندرجہ ذیل چند خطوط سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا:

"لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء

سرکار والا۔ تسلیم

میں ستمبر کا قریباً کل مہینہ لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کانپور مسجد کے مقدمے کے لئے گیا، وہاں سے دہلی آیا اور حاذق الملک صاحب کے ہاں بغرضِ علاج مقیم رہا۔ الہ آباد بھی گیا، وہاں دو روز مولانا اکبر کی خدمت میں رہا۔ آپ کا ذکر خیر آتا رہا۔ لاہور آکر ابھی دم ہی لیا تھا کہ ایک مقدمے کے لئے فیروزپور جانا پڑا۔ غرض کہ یہ تمام دن سفر میں گذرے اور اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں عریضۂ نیاز نہ لکھ سکا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے لاہور میں ہوں اور شکر ہے کہ ہر طرح سے خیریت ہے۔

مہاراجہ بہادر الور کی طرزِ گفتار سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ملازمت میں لینے کے خواہش مند ہیں مگر پرائیوٹ سکریٹری کی جگہ کی تنخواہ اتنی تھی کہ میں اسے قبول نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ غالباً ان پر زور ڈالا گیا ہے کہ اس جگہ کے لئے کسی ہندو کی تقرری مناسب ہے، اور شاید یہ درست بھی ہو، یہی وجہ تھی میرے الور نہ جانے کی۔

راقم الدولہ ظہیر مرحوم کو آپ خوب جانتے ہیں۔ دہلی میں ان کا نواسہ مجھ سے ملا تھا اور کہتا تھا کہ مہاراجہ بہادر نے ازراہ مرحمت کریمانہ ظہیر مرحوم کی سوانح اور قصائد کے طبع و اشاعت کے لئے دو سو روپے کی رقم عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شرفا پروری کا اجر عظیم ارزانی

فرمائے۔ ظہیر کے سوانح دلچسپ ہیں، خصوصاً غدر کے ایام کے واقعات، جو انھوں نے لکھے ہیں، تاریخی اہمیت رکھنے کے علاوہ عبرتناک ہیں علیٰ ہذا القیاس ان کے قصائد کا دیوان بھی عمدہ ہے۔ میں نے ان کے نواسے کو ہدایت کی ہے کہ وہ سوانح عمری ظہیر خواجہ حسن نظامی کے سپرد کرے تاکہ خواجہ صاحب موصوف اسے کاٹ چھانٹ کر اشاعت کے لئے تیار کریں۔ ان کے نواسے کی یہ خواہش ہے کہ رقم معہودہ مبلغ دو صد روپیہ آپ براہ راست خواجہ صاحب کی خدمت میں ارسال کریں کیونکہ اب اس کتاب کی اشاعت کے وہی ذمہ دار ہیں۔ مجھ سے اس نے کہا کہ میں بھی جناب کی خدمت میں سفارش کردں کہ وہ رقم خواجہ صاحب کی خدمت میں ارسال کریں۔ سو از راہ کرم خواجہ نظامی کی خدمت میں وہ رقم ارسال فرمائیے۔ غالباً ظہیر مرحوم کے نواسے اشتیاق حسین نے بھی آپ کی خدمت میں عریضہ نیاز اس مطلب کا تحریر کیا ہوگا۔

سُنا ہے حیدرآباد میں پھر تغیرات ہونے والے ہیں۔ سالار جنگ بغرض تعلیم ولایت جاتے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر علی امام وزارت پر مامور ہوں گے۔ کیا اس خبر میں صداقت ہے؟

میں نے پہلے عریضے میں ایک شعر آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ اس زمین میں، دو شعر اور ہو گئے۔ عرض کرتا ہوں:

گم گشتۂ کنعاں ہے اے خوگر زنداں تو
ہستی کے خیاباں میں ہر پھول زلیخا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
تو ہستئ بینا ہے، دانا ہے، توانا ہے

مرزا جلال الدین آداب عرض کرتے ہیں۔ بچوں کو میری طرف سے پیار۔ سرکار

کی عزت افزائی کی خبر سے دل شاد ہوا۔ اللھم زد فزد۔

خادمِ دیرینہ، محمد اقبال، لاہور

"لاہور، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء

سرکار والا تسلیم

سرکار کا والا نامہ ملا، جس پر دستخط گرامی نہ تھے، چند روز ہوئے موصول ہوا۔ ساتھ ایک خط جناب کے کسی اہل کار کا تھا، جس سے نہایت وحشت ناک خبر موصول ہوئی، یعنی یہ کہ راجہ عثمان پرشاد سرکار کو داغِ مفارقت دے گئے۔ کیا کہوں کس قدر تکلیف روحانی اس خبر کو سن کر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کو جنت نصیب کرے اور اس کے پیار کرنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آپ کی نگاہ نظامِ عالم کی حقیقت پر ہے اور آپ کا قلب ان تمام کیفیات سے لذت اندوز ہو چکا ہے جن کو رضا و تسلیم کہتے ہیں۔ پھر میں کیسے تلقین صبر کروں۔ زندگی اور موت ایک عجیب راز ہے، خصوصاً بچوں کی موت تو ایک ایسا سربستہ راز ہے کہ اس کا انکشاف حضرت انسان سے ممکن نہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحوم بچے کی والدہ کو صبر جمیل و اطمینانِ قلب عطا کرے اور نعم البدل ارزانی فرمائے۔ مایوس نہ ہو جائیے:

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے

جب مصیبت اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے اور انسان کے کیریکٹر کو اچھی طرح پڑھ چکتی ہے تو رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے، سو وہ وقت دور نہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم آپ کے شامل حال ہو۔

میں خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ صرف دردِ گردہ کا دورہ کبھی کبھی ہو جاتا ہے جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ کاش میں اس وقت آپ کے قریب ہوتا اور آپ کے دکھ درد میں شریک ہو سکتا۔ والسلام

آپ کا نیاز مند قدیم، محمد اقبال، لاہور

"لاہور، ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء

سرکار والا۔ آداب عرض

جناب کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ نوحہ پڑھ کر قلب سخت متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سکون قلب نصیب کرے اور آلام و افکار سے نجات دے۔ ماشاء اللہ آپ کی تصانیف تو بہت سی ہوں گی جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے ناموں کی ایک فہرست ارسال فرمائیے۔ سر تھیوڈور ماریسن، ممبر کونسل سکریٹری آف اسٹیٹ کی درخواست ہے کہ میں ایک مضمون اردو لٹریچر کی تاریخ پر لکھوں۔ یہ مضمون "کیمرج ماڈرن ہسٹری آف انڈیا" کا، جو لکھی جا رہی ہے، ایک باب ہوگا — سر تھیوڈور نے مجھے بڑے اصرار سے لکھا ہے اور میں بہ سبب ان کی عنایات کے انکار نہیں کر سکتا۔ بنگالی لٹریچر پر مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور لکھیں گے۔

میں اس مضمون میں آپ کا خصوصیت سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یقین فرمائیے یہ "یار فروشی" نہیں بلکہ عین انصاف ہے کہ جو کچھ آپ نے اس میدان میں کیا ہے، اس کا اعتراف کیا جائے۔ اور زیادہ کیا عرض کروں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے اور جس چیز کے لئے نوحے میں آپ نے دعا فرمائی ہے وہ عطا کرے۔ چند روز تک نوحہ ارسال خدمت کروں گا۔

ہاں ایک اور بات یاد آئی۔ میرے بڑے بھائی شیخ عطا محمد ۳۲ سال کی ملازمت کے بعد حال میں پنشن یاب ہوئے ہیں۔ فنِ تعمیر (انجینئرنگ) میں کمال رکھتے ہیں۔ انھوں نے چیف انجینئر صاحب حیدرآباد اور میر کرامت اللہ خاں صاحب سپرنٹنڈنگ انجینئر کی خدمت میں درخواست ملازمت بھیجی ہے۔ میں نے ان کی فرمائش پر ہر قسم کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اس بارے میں آپ اپنا اثر ان کے لئے استعمال کریں تو میں نہایت ممنون و مشکور ہوں گا۔ مسٹر حیدری کو بھی میں نے ایک عریضہ اسی غرض سے لکھا ہے۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ پھر انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔

آپ کا خادمِ دیرینہ، محمد اقبال، لاہور

سرکارِ والا تبار! تسلیم

والا نامہ مع رسالہ "تزکِ عثمانیہ" ابھی ملا جس کے لئے سپاس گزار ہوں۔ چند روز ہوئے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا۔ تعجب ہے کہ آپ تک نہ پہنچا۔ بلکہ اس عریضے سے پیشتر بھی ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا، جب میں نے اخباروں میں آپ کے جدِ بزرگوار کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔

الحمدللہ آپ کا مزاج بخیر۔ اقبال ہر حالت میں، خواہ مصروف ہو خواہ فارغ، آپ کا دعاگو ہے۔ اگست شملہ میں کٹا۔ وہاں والدۂ مکرمہ کی ناگہانی علالت کی خبر گئی تو واپس ہوا۔ الحمدللہ کہ اب ان کو افاقہ ہے۔ مگر ان کو آرام ہوا تو بیویاں یکے بعد دیگرے بخار میں مبتلا ہو گئیں۔ پرسوں سے ان کو بھی آرام ہوا۔ اب مع الخیر سیالکوٹ سے لاہور آیا ہوں۔ کل ایک مقدمے میں پٹیالہ جاتا ہوں۔ وہاں سے حضرت امیر خسرو کے عرس پہ دہلی بھی جاؤں گا اور وہاں سے چند دنوں کے لئے گوالیار

جاؤں گا، کیونکہ مہاراجہ بہادر اقبال کی قدر دانی پر مائل ہیں۔ ان کا خیال یہی ہے کہ اس قدر دانی کا عملی ثبوت دیں۔ رسالہ "تزک عثمانیہ" نظر سے گذرا۔ نہایت اچھا رسالہ ہے اور کیوں نہ ہو؟ آخر کس کی سرپرستی میں نکلے گا، وہ جس کی ہنر پروری سارے ہندوستان پر روشن ہے اور جس کا مذاقِ سخن و سخن گوئی علمی دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ اس رسالے کی اٹھان اچھی ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ بہت ترقی کرے گا۔ مگر حجم زیادہ ہونا چاہیئے اور یہ کوشش ہو کہ حیدر آباد کے علمی حلقوں میں اس رسالے کی وساطت سے جدید مذاق پیدا ہو اور نئی پود کے ہونہار لکھنے والے وہاں کی پبلک سے، اور علی العلوم ہندوستان کی پبلک سے، روشناس ہو جائیں۔ پالیٹکس سے اسے مطلق سروکار نہ ہو، محض ادبی رسالہ ہو۔ زیادہ کیا عرض کروں، جی رہا ہوں۔ دو شعر حاضر ہیں۔ مولانا اکبر کا رنگ ہے:

دیکھئے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک
شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے

ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیم جدید
میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

مخلص محمد اقبال بیرسٹر، لاہور

۵ ستمبر ۱۹۱۴ء

لاہور، ۲۱ دسمبر ۱۹۱۵ء

سرکار والا! نوازش نامہ مل گیا ہے۔ اس سے پیشتر ایک عریضہ ارسالِ خدمت کر چکا تھا۔ امید کہ پہونچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہوگا۔ کل شام خواجہ کمال الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ دیر تک آپ کے اخلاقِ حمیدہ کا ذکر ایک پرائیویٹ مجمع میں کرتے رہے۔ میرے لئے یہ ذکر باعث مسرت تھا۔

آپ نے مومن مرحوم کا شعر "تم مرے پاس ہوتے ہو گویا" الخ، خوب یاد دلایا۔ مگر مومن مرحوم نے یہ شرط لگادی ہے کہ: "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"۔ اقبال انجمن و خلوت، سفر و حضر ہر حال میں آپ کے ساتھ ہے۔ سنا ہے کہ مسٹر الما لطیفی برٹش انڈیا میں اپنے عہدے پر واپس آتے ہیں۔ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مگر کوئی سبیل نہیں نکلتی، تاہم منتظر رہتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کوئی نہ کوئی رستہ پیدا کرے گا۔ آپ کی غزل "دل چہ فروشم" "ذخیرے" میں نظر سے گذری، خوب تھی۔ آپ بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ مگر وہاں کی ایک پارٹی آپ کی مؤید ہے اور آپ کے الفاظ کی مختلف تعبیر کرتی ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے سلامت رہو ہزار برس۔

خادمِ کہن، محمد اقبال

لاہور، ۱۴ اپریل ۱۹۱۹ء

سرکارِ والا تبار! تسلیم مع التعظیم

والا نامہ مورخہ ۷ اپریل ابھی چند منٹ ہوئے موصول ہوا۔ اس سے پہلے ایک عریضہ لکھ کر ارسال کر چکا ہوں جس میں خواجہ حافظ اور خواجہ حسن نظامی کے متعلق عرض کیا تھا۔ امید کہ وہ عریضہ سرکار تک پہونچ گیا ہوگا۔ بات بہت طویل ہے۔ چند روزہ صحبت میسر آئے تو عرض کروں۔ آپ سے ملنے کو دل بھی چاہتا ہے مگر کیا کروں، پابہ زنجیر ہوں۔ چند روز کے لئے بھی لاہور چھوڑنا محال ہے۔ کسی وقت اس قسم کے موانع کی وجہ سے اتنا گھبراتا ہوں کہ بے اختیار موجودہ پیشے کی قیود کو توڑ تاڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں مگر وہی مثل ہے:

چہ خورد بامداد فرزندم

مگر جس حال میں ہوں شکر گذار ہوں شکایت میرے مذہب میں کفر بلکہ شرک ہے۔
یہ مثنوی جس کا نام "اسرارِ خودی" ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے، اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لئے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے، اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو، خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے۔ مگر:

من صدائے شاعر فرداستم

اور:

نا امید ستم ز یاران قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا، نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بار آور ہوگا۔ مجھ سے

اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ۔

(خط کا یہ تمام صفحہ پرائیویٹ ہے۔ بہتر ہو کہ اسے تلف کر دیا جائے)۔

زیادہ کیا عرض کروں:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

امید کہ سرکار کا مزاج بخیر ہوگا۔ بچوں کو میری طرف سے دعا کہیئے۔ مثنوی کے حصۂ دوم کے تین ابتدائی اشعار عرض کر کے اس خط کو ختم کرتا ہوں:

چوں مرا صبحِ ازل حق آفرید
نالہ در ابریشمِ عودم تپید
عشق را داغے مثالِ لالہ بس
در گریبانش گلِ یک نالہ بس
من ہمیں یک گل بدستارت زنم
محشرے بر خوابِ سرشارت زنم

خادمِ دیرینہ، محمد اقبال

۱۱

خطوطِ اقبال

"خطوطِ اقبال" علامہ اقبال کے ایک سو گیارہ غیر مدون خطوط کا مجموعہ ہے جو، کہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے مرتب کیا ہے اور مکتبۂ خیابانِ ادب لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا ہے۔

ان خطوط میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے اور بعض ایسے

ہیں جو دوسرے مجموعہ ہائے مکاتیب میں موجود ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی صاحب نے محنت اور سلیقے سے یہ خطوط مرتب کئے ہیں اور ان پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس سے ان خطوط کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ چند خطوط یہاں نقل کئے جاتے ہیں :

"از لاہور، گورنمنٹ کالج، ۲۴ فروری ۱۹۰۵ء

مخدوم و مکرم جناب شاطر

تسلیم! آپ کا نوازش نامہ مع قصیدہ پہنچا۔ اس قصیدے کا کچھ حصہ 'مخزن' میں شائع ہو چکا ہے اور پنجاب میں عموماً پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ہمارے ایک کرم فرما جالندھر میں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ اس کو نہایت پسند کرتے ہیں اور اس کے اشعار کو انھوں نے اتنی دفعہ پڑھا ہے کہ اب ان کو وہ تمام حصہ جو 'مخزن' میں شائع ہو چکا ہے، ازبریاد ہے۔ اکثر اشعار نہایت بلند پایہ اور معنی خیز ہیں۔ بندشیں صاف اور ستھری ہیں اور اشعار کا اندرونی درد مصنف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہایت نمایاں کر کے دکھا رہا ہے۔ انسان کی روح کی اصل کیفیت 'غم' ہے، خوشی ایک عارضی شے ہے۔ آپ کے اشعار اس امر پر شاہد ہیں کہ آپ نے فطرت انسانی کے اس گہرے راز کو خوب سمجھا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں اس کے سقموں سے آپ کو آگاہ کروں میں آپ کے حسن ظن کا ممنون ہوں مگر بخدا مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ آپ کے کلام کو تنقیدی نگاہ سے دیکھوں۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میرے اشعار کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن آپ نے شاید میرے حق سے بڑھ کر مجھے داد دی ہے۔ میں آپ کے نوازش نامے کا ابتدائی حصہ دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہوں اور آپ کی

وسعت قلب پر حیران. خدا آپ کو جزائے خیر دے اور ہمیشہ بامراد رکھے۔
آپ کے خاندانی تعزز کا حال معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ آپ
لوگ گذشتہ کاروان اسلام کی یادگاریں ہیں اور اس وجہ سے ہر طرح
واجب الاحترام اور قابل تعظیم ہیں جس قصیدے کے ارسال کرنے کا وعدہ
آپ فرماتے ہیں، میں اس کا شوق سے منتظر رہوں گا۔ والسلام

آپ کا نیازمند

محمد اقبال از لاہور، گورنمنٹ کالج بھاٹی دروازہ

پیرس، ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء

ڈیئر منشی طاہر دین۔ السلام علیکم

میں آج شام ہسپانیہ سے مع الخیر واپس آگیا۔ خدا کے فضل و کرم سے وہاں ہر طرح خیریت رہی اور اپنی خواہش کے مطابق مسجد قرطبہ میں نماز پڑھی۔ اب یہاں چند روز قیام کر کے وینس جاؤں گا۔ وہاں سے جہاز ۱۰ فروری کو چلتا ہے۔ انشاء اللہ العزیز ۲۲ فروری کی صبح کو بمبئی پہونچ جاؤں گا۔ احباب سے دعا کی درخواست کریں۔ ۲۴ فروری کی شام کو میں نے میڈرڈ (دارالسلطنت ہسپانیہ) میں "اسلام اور ہسپانیہ" پر وہاں کے وزیر تعلیم کی درخواست پر لکچر دیا جس سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کریں۔ افسوس کہ وہ اس سفر میں ساتھ نہ تھے۔

مولوی غلام رسول مہر، سالک اور سید شبیر حیدر صاحب سے سلام کہیں علی بخش اور رحمان کو بھی سلام۔ جاوید، منیرہ بیگم اور آپ کے بچوں کو دعا۔ والسلام

محمد اقبال

۱۲
شاد اقبال

"شاد اقبال" کے نام سے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کے چند خطوط مرتب کئے اور ۱۹۴۲ء میں ان کو حیدر آباد سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں صرف ۴۹ خطوط شامل ہیں۔ اب یہ مجموعہ تقریباً نایاب ہے۔

چوتھا باب

علامہ اقبال کے موضوعاتِ نثر

۱

علامہ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر اور ایک عظیم شاعر تھے۔ ان کی زندگی کا زیادہ وقت شاعری کی تخلیق میں گذرا۔ یہی وجہ ہے کہ نثر میں انھیں اس پائے کی تصانیف پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا جیسی کہ انھوں نے نظم میں پیش کیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ سوائے "علم الاقتصاد" کے اقبال کی کوئی اور مستقل تصنیف نثر میں نہیں ہے۔ ان کا بیشتر نثری سرمایہ، جیسا کہ ان کی تصانیف نثر کے جائزے سے معلوم ہوگا، ان مضامین و مقالات پر مشتمل ہے جو انھوں نے "مخزن"، "اخبارِ وطن" اور بعض دوسرے رسائل و اخبارات میں لکھے۔ یا پھر ان کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے مختلف دوستوں اور عزیزوں کو اپنی زندگی میں لکھے۔ مضامین و مقالات "مقالاتِ اقبال" کے نام سے اور خطوط کے مختلف مجموعے "اقبال نامہ" "مکتوباتِ اقبال"، "مکاتیبِ اقبال"، "خطوطِ اقبال" اور "انوارِ اقبال" کے مختلف ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین و مقالات اور خطوط میں انھوں نے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی نثر میں ان کو سمویا ہے۔ اس لئے موضوع کے

اعتبار سے بھی ان کی یہ نثری تحریریں اہمیت رکھتی ہیں، کیونکہ ان سب کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے جو اسلوبِ نثر اختیار کیا ہے، وہ انھیں موضوعات و مضامین کا مرہونِ منت ہے۔ اسی خیال سے اس کی تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے۔

۲

اُردو نثر میں علامہ کی پہلی کتاب، جو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، "علم الاقتصاد" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے انسانی زندگی کے اقتصادی اور معاشی پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اہم علمی معاملات و مسائل کو اعتماد کے ساتھ آسان اور سادہ لیکن عالمانہ زبان میں پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کو ان معاملات سے گہری دلچسپی تھی اور وہ شروع ہی سے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرکے اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ:

"یہ علم (علم الاقتصاد) انسان کے لئے انتہا درجے کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے، بالخصوص اہلِ ہندوستان کے لئے تو اس کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور ان تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح بہبود کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنے تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں ان کا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال ہی میں مہاراجہ بڑودہ نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے، اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہلِ ہندوستان

دفتر اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کرکے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہے۔ میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کردوں اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہوگئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی"۔ [1]

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے اس موضوع سے دلچسپی ہی اس لئے لی کہ ہندوستان کے لوگوں کی زبوں حالی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اس کا مداوا کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے انھوں نے اقتصادی اور معاشی معاملات پر قلم اٹھایا۔ اس کی منطقی اور فلسفیانہ تحلیل کی تاکہ پڑھنے والوں کو ان کے نشیب و فراز سے آگاہی ہو، اور وہ ان سے آگاہ ہو کر اپنے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ ملکی اور قومی ترقی میں معاشی اور اقتصادی معاملات سے آشنا ہونا کتنا ضروری ہے۔

علامہ اقبال نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں بنیادی طور پر یہی خیال ان کے پیش نظر رہا ہے اور اسی خیال نے ان کے یہاں ایک ایسے اندازِ بیان کو پیدا کیا ہے جو عالمانہ ہونے کے باوجود سمجھ میں آتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے، الجھاؤ نہیں ہے، وہ مبہم بھی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے آسان اور سادہ لیکن تحلیلی اور تجزیاتی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی گرفت اپنے موضوع پر کتنی سخت ہے۔ پھر اقبال کے ہاں اس موضوع پر نئی معلومات بھی ہیں۔ انھوں نے ان مسائل کو پیش کرتے ہوئے کسی خاص کتاب کو اپنے سامنے نہیں رکھا، ترجمہ بھی نہیں کیا۔ برخلاف

---

[1] علم الاقتصاد، صفحات ۲۴، ۲۵۔

اس کے مختلف تصانیف کو سامنے رکھا اور ان کے مطالعے کے بعد وہ معلومات فراہم کیں جو ان کی ایسی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں :

"یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں، اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے، مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔" ۱

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی ان تحریروں میں ان کی انفرادیت پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے اور ہر جگہ ان کے علم و فکر کی اجتہادی شان کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے اقبال کی ان تحریروں کے بارے میں لکھا ہے :

"علم الاقتصاد اگرچہ ایک ابتدائی کتاب ہے اور اقبال کی جواں سالی کا پہلا ثمر ہے، لیکن جہاں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اپنے زمانے کی معاشی صورت حال پر اپنی طرف سے تنقید کی ہے، اس سے ان کی خداداد قابلیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور ان کی نظر کی وسعت، رائے کی پختگی اور عالی دماغی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ معاشیات کے میدان میں بھی کام آیا ہے۔" ۲

غرض یہ کہ اقبال کے مزاج کے فکری رجحان، ان کی طبیعت کے فلسفیانہ میلان، ان کی نظر کی وسعت، ان کی رائے کی پختگی اور عالی دماغی نے اقتصادیات اور معاشیات پر ان کی تحریروں کو علمی اعتبار سے نہایت وقیع اور اہم بنا دیا ہے، کیونکہ وہ اپنی گہرائی اور گیرائی کے باوجود عام فہم ہیں۔ اور پھر ان میں جو ایک مثبت اور تعمیری زاویۂ نظر ہے، وہ ان کے پڑھنے والوں کے دل اور دماغ دونوں میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

۱۔ علم الاقتصاد، ص ۲۵۔ ۲۔ ایضاً، ص ۱۴۔

صرف مندرجہ ذیل دو اقتباسات سے اس کا اندازہ ہوگا:

"علم تمدن وہ علم ہے جو انسانی زندگی کا افضل ترین مقصد اور اس کے حصول کے طریق معلوم کرتا ہے۔ اس علم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ تمام دیگر علوم کا موضوع ذات انسان ہے، جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدن کا موضوع ہے۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصل وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو۔ اگر یہ شے ہماری افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو پھر اس کا کیا فائدہ۔ لہٰذا علم اقتصاد جس کا موضوع دولت ہے، وسیع تمدن پر مبنی ہے جس کا منشا ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ کرنا ہے۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے اور یہ تمام اشیا دولت، صحت اور فرائض کی انجام دہی وغیرہ اس مقصد کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں۔ چونکہ علم تمدن کا منشا ہمارے اعلیٰ ترین مقصد کی حقیقت کا معلوم کرنا ہے اور ہماری روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کی حقیقی قدر اس علم کے لحاظ سے فیصلہ پاتی ہے، اسی واسطے علم اقتصاد اور دیگر انسانی علوم علم تمدن سے ایک نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک معنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس پر مبنی ہیں۔" [۱]

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے سیل رواں کو مسدود کرنے کے لئے کسی زیادہ زبردست روک کا ہونا ضروری ہے۔ تاہم موجودہ حالت میں جدید ضروریات کا پیدا ہوتے جانا کسی اور روک کے نہ ہونے سے اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی محققین کے نزدیک، جہاں تک ممکن ہو، سامان معیشت ارزاں نہیں ہوتا

---

[۱] علم الاقتصاد، ص ۲۲۔

چاہیئے، کیونکہ حکیم مالتھیس کے مسائل کی رو سے اشیائے خوردنی کی ارزانی افزائش آبادی کے خوفناک نتائج کی طرف سے انسان کو اندھا کردیتی ہے اور یہ بے فکری اس کی آئندہ بہبودی کی دشمن ہوتی ہے۔ اگر لوگوں کے روزمرہ استعمال کی اشیا ارزاں سے ارزاں ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ ایک سال فصل کے نہ ہونے سے ان کی جان پر آبنے گی۔ کیونکہ ان کا گذارہ پہلے ہی سے ایسی اشیا پر تھا جو تمام دیگر اشیا کی نسبت ارزاں تھیں اور اب اس آڑے وقت کے لئے کوئی ارزاں تر شے نہ ہوگی جس پر وہ اپنا گذارہ کرسکیں۔" ؎۱

ان اقتباسات میں خالص علمی باتیں ہیں لیکن علامہ اقبال نے ان باتوں کو آسان رواں اور بامحاورہ زبان میں اس طرح واضح کیا ہے کہ ذہن ان کو نہ صرف قبول کرنے کو تیار ہو جاتا ہے بلکہ ان سے لطف اندوز ہونے کا سامان بھی فراہم کردیتا ہے۔

۳

نثر اقبال کا ایک اور اہم موضوع قومی و ملّی زندگی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کوئی باقاعدہ ضخیم کتاب تو نہیں لکھی ہے، لیکن جو کچھ انھوں نے اس موضوع پر اپنی شاعری میں کہا ہے اس کی تفسیر اپنے بعض مضامین نثر میں بیان کی ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۴ء میں "مخزن" میں قومی زندگی پر ایک مفصل مضمون لکھ کر اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی: اگرچہ یہ مضمون علامہ کی ابتدائی نثری تحریروں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے لیکن اس میں علمیت کے ساتھ ساتھ ایک تجزیاتی انداز اور تحلیلی

؎۱۔ علم الاقتصاد، ص ۲۰۹

زاویۂ نظر بھی نمایاں ہے۔ پھر اس کے بعد اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں علامہ اقبال نے "خلافتِ اسلامیہ"، "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" اور "دین اسلام" کے سے اہم قومی و ملی موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہر اعتبار سے وقیع اور معیاری نثری تحریریں پیش کیں۔ ان مضامین کے علاوہ دیباچۂ مثنوی "اسرارِ خودی" اور دیباچۂ "پیامِ مشرق" میں بھی انھوں نے قومی و ملی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان میں سے ان کی ہر نثری تحریر بہ حیثیت موضوع اور اسلوب خاص اہمیت کی حامل ہے۔

اپنے مضمون "قومی زندگی" میں، جو ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوا، انھوں نے قوموں کے نشیب و فراز کو نہایت وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس میں تاریخ، عمرانیات اور فلسفے کا علم، باعتبارِ موضوع گہرائی کی لہریں دوڑاتا ہے۔ واقعاتِ عالم کے محرکات اور اس کے نتائج پر علامہ کی نظر بڑی گہری ہے۔ چنانچہ ذیل میں دیکھئے کہ وہ اس موضوع پر کس درجہ فکری گہرائی کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"واقعاتِ عالم کے مشاہدے سے حکما اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ زندگی کی مختلف صورتوں، یعنی انسانوں، حیوانوں، پودوں وغیرہ میں ایک قسم کی عالمگیر جنگ جاری رہتی ہے۔ گویا نظامِ فطرت کا راز کارزارِ زندگی کا ایک دردناک نظارہ ہے جس میں ہر طبقے کے حیوان اپنے ہمسایہ طبقوں سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور اس کشمکشِ حیات میں کامیاب ہونے کے لئے ہر طبقۂ زندگی مصروف رہتا ہے لیکن فتح صرف اس طبقے کو حاصل ہوتی ہے جس میں زندہ رہنے کی قابلیت ہو، یعنی جس نے زندگی کے متغیر حالات کے ساتھ موافقت پیدا کرلی ہو۔ صدہا اقسام کے چوپائے اور پرندے کبھی روئے زمین پر اور سمندروں میں موجود تھے مگر اب ان کا نام و نشان نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوں جوں زندگی کے حالات اور اس کی شرائط تبدیل ہوتی گئیں، یہ حیوان

فنا ہوتے گئے، کیونکہ یہ اس انقلاب کے مختلف مراحل میں حالات کے ساتھ موافقت پیدا نہ کر سکے۔ یہ قانون جس کو حکمائے حال نے کمال محنت سے دریافت کیا ہے، ایک عالمگیر قانون ہے۔ انسان، حیوان، چرند، درخت غرضیکہ زندگی کی کوئی ایسی صورت نہیں جو اس کے اثر سے آزاد ہو لیکن اس وقت یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس زبردست قانون نے طبقۂ انسانیت کے نشوونما اور اس کے ارتقاء پر کیا عمل کیا ہے اور اب کیا کر رہا ہے۔ کیا موجودہ انسان ابتدا سے ہی ایسا تھا جیسا کہ اب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نوع انسان کی موجودہ نسل ان زبردست اور قومی تہذیبوں اور تمدنوں کی یادگار ہے جو زندہ رہنے کی کوششوں میں فنا کا شکار ہوئیں، اور فنا بھی اس طرح ہوئیں کہ اس وقت ان کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ہے۔ اہرام مصری کے بانی ہزارہا سال ہوئے کہ مٹ گئے، یونانیوں کے اشراقین اور مشائین کے فلسفے رہ گئے، لیکن قوم کا نام و نشان تک دنیا میں نہیں ہے۔ افریقہ کی وہ زبردست قوم جس کے دلیر فوجی افسروں نے ممالک مغرب کو پامال کر کے اہل روما کی عظیم الشان سلطنت پر حملے کئے تھے، اب کہاں ہیں؟ کیا اس قوم کی کوئی یادگار باقی ہے؟ صدہا قومیں پیدا ہوئیں پھلیں پھولیں اور آخرکار اس اٹل قانون کے عمل سے متاثر ہو کر خاک میں مل گئیں۔"[1]

انسانی زندگی کے جدلیاتی عمل اور اس کے نتائج کو علامہ نے اس تحریر میں اپنا موضوع بنایا ہے، لیکن اس مشکل موضوع کو اس طرح پیش کیا ہے کہ فلسفیانہ انداز کی پیچیدگی اس میں نظر نہیں آتی۔ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں علامہ اقبال اس خیال کو اس طرح روشن کر دیتے ہیں جیسے اس میں کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں۔

---

[1] مقالات اقبال، ص ۵۱

یہ سب کچھ اس گرفت کا نتیجہ ہے جو علامہ اقبال کو اپنے موضوع پر ہے اور یہ گرفت اس درجہ سے ہے کہ علامہ کا مطالعہ وسیع ہے، ان کی فکر میں گہرائی ہے اور ان کے خیالات میں گرمی اور روشنی ہے۔

اقبال کی نگاہ دوربیں ان نظریاتی حقائق کی روشنی میں اپنے قومی مسائل کی تہ تک پہونچتی ہے اور اس کی تمام گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ معاشی مسائل کس طرح حل ہو سکتے ہیں؟ معاشرتی معاملات کی کیا صورت ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟ علمی اور تعلیمی ماحول قومی زندگی کو کس طرح متاثر کرتا ہے؟ دین اور مذہب کی قومی زندگی میں کیا اہمیت ہے اور وہ اس کے مختلف شعبوں کو کس طرح متاثر کرتے ہیں؟ غرض وہ ان مسائل کے تمام پہلوؤں پر مفکرانہ اور جذباتی انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ان واقعات کی روشنی میں اگر ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے۔ کیا ہمارا ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہے؟ اپنے مکان کے اسبابِ آرائش ہی کو دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ذرا ذرا سی بات کے لئے ہم اقوامِ غیر کے محتاج ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کا لیمپ جرمنی میں بنا ہے، اس کی چمنی آسٹریلیا میں تیار ہوئی ہے، اس کا تیل روس سے آیا ہے اور گندھک کی سلائی جس سے یہ لیمپ روشن ہوتا ہے، سویڈن یا جاپان سے پہونچی ہے۔ کلاک جو آپ کی نشست گاہ میں آویزاں ہے امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا۔ اور وہ چھوٹی سی گھڑی جو آپ کی جیب میں ٹک ٹک کر رہی ہے جنیوا کے کاریگروں کی صنعت کا نمونہ ہے ـــــ ایسے حالات میں جب تجارت کی طرف سے ہمارا ملک بالکل غافل ہو، یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ مصارف زندگی میں، جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے

ہم کامیاب ہوں گے؛؛ ؎۱

آگے چل کر قومی تمدن کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"_____ اس وقت ہمیں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے، یعنی اصلاحِ تمدن اور تعلیمِ عام مسلمانوں میں اصلاحِ تمدن کا سوال درحقیقت ایک مذہبی سوال ہے، کیونکہ اسلامی تمدن اصل میں مذہب اسلام کی عملی صورت کا نام ہے، اور ہماری تمدنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصول مذہب سے جدا ہو سکتا ہو۔ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ میں اس مسئلے پر مذہبی اعتبار سے گفتگو کروں۔ تاہم میں اس قدر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حالاتِ زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہ کے استدلالات جس کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے ایک نظرِ ثانی کے محتاج ہیں؛؛ ؎۲

یہ اجتہاد کی باتیں ہیں جو قومی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر سکتی ہیں۔ اقبال نے اس کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، لیکن چونکہ مسئلہ نازک ہے اس لیے آنند رام مخلص کا یہ شعر نقل کر کے آگے بڑھ گئے ہیں :

نیست جرأت بہ عرضِ حال مرا
گلہ مندم زبے زبانی ہا

پھر بھی انھوں نے تعلیمِ نسواں، تعددِ ازدواج، پردہ اور صنعت و حرفت کے موضوعات پر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں روشن خیالی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ یہ خیالات اقبال کی نثر کے ذریعے دلوں میں اترتے ہیں اور شخصیت کا جز بن جاتے ہیں۔ یہی اقبال کا کمال ہے۔

؎۱۔ مقالاتِ اقبال، ۱۵ ؎۲۔ مقالاتِ اقبال، ص ۵۵۔

یہ خیالات انھوں نے بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں اپنی نثر کے ذریعے پیش کئے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کے ہاں قومی اور ملّی مسائل کے اظہار میں زیادہ فکری گہرائی پیدا ہوتی گئی اور جس نثر کے ذریعے انھوں نے ان خیالات کو پیش کیا، وہ پختہ سے پختہ تر ہوگئی لیکن اس میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا نہیں ہوا۔ بر خلاف اس کے موضوعات کا اظہار زیادہ واضح ہوتا گیا۔

اس اعتبار سے ان کے مضامین "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" اور "دیباچۂ مثنوی اسرارِ خودی" خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ اول الذکر مضمون اقبال نے ۱۹۱۰ء میں لکھا اور آخر الذکر ۱۹۱۵ء میں۔ ان دونوں میں قومی مسائل کا تجزیہ نسبتاً زیادہ فکری گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان میں پختگی بھی زیادہ نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصلِ اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں، جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اس کے لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہونچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور میں ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اختصاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے کی قابلیت طبعًا موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائلِ مخصوصہ اور شمائلِ مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض

اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے۔" [۱]

اسی طرح دیباچے میں تصوّف اور وحدت الوجود کے موضوع کو یوں سیدھے سادے انداز میں پیش کرتے ہیں :

"مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہوسکتی ہے مگر مسئلۂ انا کی تحقیق و تدقیق بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت رکھتی ہے، اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے 'گیتا' کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔" [۲]

اس موضوع کو پیش کرنے میں علامہ اقبال نے جس جرأت مندانہ انداز سے کام لیا اور جس بے باکی کے ساتھ اس موضوع کو پیش کیا ہے، وہ کچھ انھیں کا حصہ ہے۔

غرض یہ کہ قومی زندگی کے مختلف موضوعات کو پیش کرنے کے لئے اقبال نے جو نثر لکھی ہے، وہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں کسی قسم کا الجھاؤ اور ابہام نہیں ہے۔ اس میں صفائی اور صاف گوئی، بے خوفی اور بے باکی کی خصوصیات ہیں۔ وہ بڑی ہی مربوط نثر ہے اور اس کا بنیادی مقصد سنجیدہ اور علمی موضوعات کو تجزیاتی انداز میں پیش کرنا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کو ایسی نثر لکھنے میں پوری طرح کامیابی ہوئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اقبال نے قومی، ملّی اور فلسفیانہ موضوعات کو پیش کرنے کے لئے ایک ایسا اندازِ نثر پیدا کیا جو اردو نثر کی روایت میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[۱] مقالاتِ اقبال۔ رموز بیخودی پر ایک عمرانی نظر، صفحات ۱۱۹ - ۱۲۰

[۲] مقالاتِ اقبال، ص ۱۵۵

۴

قومی زندگی، اسلام، مسلمان اور تصوف کے موضوعات پر علامہ نے بہت کچھ لکھا ہے مضامین، خطوط اور دیباچوں وغیرہ میں ان موضوعات پر اچھی خاصی بحثیں ہیں اور ان کی بدولت اعلیٰ درجے کی نثر پیدا ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ زبان اور لسانی معاملات اور ادب و شعر سے متعلق مختلف موضوعات کا بھی ان کی نثر میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ان موضوعات نے علامہ اقبال کو ماہر لسانیات اور ایک اچھا نقاد بھی ثابت کر دیا ہے۔

لسانیات کے موضوع پر ان کا پہلا مضمون ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوا۔ یہ مضمون خود اقبال نے نہیں لکھا بلکہ ڈاکٹر وانٹ برجینٹ کے مضمون کا ترجمہ ہے جو علامہ اقبال نے شوق اور دلچسپی سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ مدیر "مخزن" سر عبدالقادر کی فرمائش پر کیا گیا۔ اس کی وضاحت مندرجہ ذیل نوٹ سے ہوتی ہے جو اس ترجمے کے ساتھ "مخزن" میں شائع ہوا تھا:

"ڈاکٹر وانٹ برجینٹ صاحب نے، جن کو السنۂ مشرقیہ کے ساتھ بالخصوص دلچسپی ہے، انگریزی زبان میں ایک مختصر سا مضمون اردو زبان پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا علم و فضل ہماری تعریف کا محتاج نہیں۔ ان کی عالمانہ گفتگو اور وسیع ہمدردی کو اگر صبا ذِ فلق کہا جائے تو ہر طرح سے زیبا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ اردو زبان کے بانکپن نے مغربی فضا کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ ہماری درخواست پر ہمارے دوست شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے، جنھیں اس مضمون کی کاپی ڈاکٹر صاحب نے تحفتہً دی تھی، اسے ناظرینِ مخزن کے لئے ترجمہ کر کے بھیجتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس مضمون میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ علامہ اقبال کے نہیں ہیں لیکن مضمون کے ترجمے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس موضوع کے ساتھ خاص دلچسپی ہے اور اسی دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے کا انداز ایسا شستہ اور رواں ہے کہ اس پر طبع زاد مضمون کا گمان ہوتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے :

"...... غالب خیال یہ ہے کہ اکبر کے عہد تک مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ میل جول کرنے میں یہی برج بھاشا بولا کرتے تھے مگر شہنشاہ مذکور (اکبر) کے زمانے سے اس تغیر کا آغاز ہوتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ضرورت نے ایک نئی زبان پیدا کر دی۔ اکبر کے کئی وزراء، بالخصوص وزیر صیغۂ مال، ہندو تھے جن کو تقاضائے وقت کی وجہ سے اس وقت کی درباری زبان یعنی فارسی سیکھنی پڑی جس طرح انگلستان میں شاہانِ نارمن کے عہد سے اینگلوسیکسن اور نارمن فرینچ کی آمیزش سے، یا یوں کہو کہ فارسی اور برج بھاشا کے ازدواج سے اُردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ فارسی بولنے والے مسلمان سپاہی، جن کو روزمرہ کے کاروبار میں دہلی اور آگرہ کے باشندوں کے ساتھ واسطہ پڑتا تھا، اس آمیزش کے اور بھی ممد ہوئے، یہاں تک کہ ہندی مغربی قشون شاہی یعنی اُردوئے معلیٰ کے نام پر "اردو" کہلانے لگی"۔ [1]

یہ مضمون چونکہ ترجمہ ہے اس لئے اس موضوع پر علامہ اقبال کے خیالات کی وضاحت اس سے نہیں ہوسکتی۔ البتہ علامہ نے اسی سال (۱۹۰۲ء میں) "اُردو زبان پنجاب میں" کے عنوان سے ایک اور مضمون 'مخزن' میں لکھا۔ اس مضمون سے زبان اور لسانی معاملات پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بعض اعتراضات کے جواب کے طور پر لکھا گیا ہے لیکن اس میں بعض ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن سے اس موضوع پر

---

[1] مقالاتِ اقبال، ص ۱۲

علامہ اقبال کے خیالات کی وضاحت زیادہ صراحت سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختصار کے باوجود یہ مضمون اہمیت رکھتا ہے

اقبال اردو کی اہمیت اور اس کے ارتقائی مزاج کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"ابھی کل کی بات ہے، اُردو جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ موجود تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیرنگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی دہلوی یا لکھنوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔" [۱]

علامہ نے ان چند جملوں میں اُردو زبان کے مزاج کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ جو خیالات اس موضوع پر انھوں نے آج سے تقریباً اسّی سال پہلے ظاہر کئے گئے تھے، تاریخ نے آج ان کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ اب اردو زبان برعظیم کے ہر علاقے میں پھیل چکی ہے اور اس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام بھی لیا جا رہا ہے۔ زندگی جیسے جیسے نیا رنگ اختیار کر رہی ہے، اس میں نئی نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد علامہ اقبال نے اس مضمون میں اعتراضات کے جو جواب دیئے ہیں ان سے اس موضوع پر علامہ کے علم، شعور اور بصیرت کی وضاحت

---

[۱] - مقالات اقبال، (اُردو زبان پنجاب میں)، ص ۲۲۔

ہوتی ہے۔ اور جو انداز اس سلسلے میں وہ اختیار کرتے ہیں اس کے ایک ایک لفظ سے شائستگی ٹپکتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میرے اشعار پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سے الفاظ "چلمن کی جھلک" پر بھی ایک اعتراض ہے۔ تنقید کرنے والے ہمدرد صاحب میرے مقصود فی الذہن کو سمجھتے بھی ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ الفاظ سے یہ مطلب نہیں نکلتا۔ بھلا اگر الفاظ میرے مقصود کے اظہار سے قاصر ہیں تو آپ نے میرا مطلب کیوں کر سمجھ لیا؟ بہر حال انبالوی صاحب نے مرزا داغ دام فیضہ کا ایک شعر سند میں دے دیا ہے جس میں بعینہ یہی الفاظ انھیں معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں جو میرے ذہن میں تھے۔ علیٰ ہذا القیاس انبالوی صاحب نے "مالا" کی تانیث بھی "مفید الشعراء" مصنفہ حضرت جلال لکھنوی کے حوالے سے ثابت کردی ہے۔ اب بھی اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو مولوی سید احمد صاحب کی "فرہنگ آصفیہ" ملاحظہ فرمالیجئے۔" [۱]

بہر حال موضوع کے اعتبار سے علامہ کا یہ مضمون بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے اردو زبان کے متعلق ان کے خیالات اور زبان و بیان پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اردو زبان کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات بہت واضح ہیں۔ وہ اس زبان سے محبت کرتے تھے اور اس کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے۔ اسلامیانِ ہند کی تہذیب و ثقافت کی بنیاد، ان کے خیال میں اسی زبان پر قائم تھی۔ وہ اس زبان کو مسلمانوں کی قومی و ملی بقا کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں، ان میں اس حقیقت کو جگہ جگہ واضح کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ مقالات اقبال، ص ۲۴۴

"اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانئے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپکے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے" [۱]

"آپ کی تحریک سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جسکی ابتدا سرسید رحمتہ اللہ علیہ نے کی تھی" [۲]

"اردو کی اشاعت کے لئے آپ کا دلّی میں نقل مکانی کرنا بہت ضروری ہے معلوم نہیں آپکے حالات ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا" [۳]

"اردو کے متعلق اگر لیگ کے کھلے سیشن میں کوئی مناسب قرارداد منظور ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا اثر بہت اچھا ہو گا" [۴]

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کو وہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی ترجمان اور ان کی سیاسی جدوجہد کے لئے ایک ہتھیار سمجھتے تھے۔ اپنی نثری تحریروں میں انھوں نے جگہ جگہ اس زبان کی اہمیت کو واضح کیا ہے، اور اس موضوع پر بڑے پتے کی باتیں کی ہیں۔

زبان کے ساتھ ساتھ ادب اور شاعری کے موضوعات بھی علامہ اقبال کی نثر کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامینِ نثر اور خطوط میں کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ چنانچہ شاعری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر ممتاز حسن: اقبال اور عبدالحق، ص ۴۳

۲۔ ایضاً، ص ۴۶ ۳۔ ایضاً، ص ۴۷ ۴۔ ایضاً، ص ۵۱

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنھوں نے حضور سرور کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان رتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں، اور یہی عرب کے دور جاہلیت کی کل تخلیقی کائنات ہے۔ امراء القیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے۔ اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان کو پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طرح پر قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دیا گیا ہے، اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اٹھائی گیرا بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے، اس کو بھی ہتھیا لے۔"[۱]

اس اقتباس سے شاعری کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات و نظریات کی

۱۔ مقالات اقبال (جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ) ص ۱۸۸

وضاحت پوری طرح ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس قسم کے موضوعات پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا ہے۔ برخلاف اس کے اختصار کے ساتھ ان کی وضاحت کر دی ہے۔

علامہ کا لکھا ہوا "پیام مشرق" کا دیباچہ ادب و شعر کے موضوع کو پیش کرنے میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دیباچہ اگرچہ مختصر ہے لیکن جامعیت نے اسے بہت وزنی بنا دیا ہے۔ مثلاً یہ بات کہ معاشرتی اور تہذیبی حالات ادب و شعر کی تخلیق پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اور ان کا نتیجہ کن کن صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت علامہ نے نثر کے ان چند جملوں میں نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے کی ہے:

"پیام مشرق کے متعلق، جو گوئٹے کے "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کرلیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا اضطراب، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس واسطے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے، اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے"[1]

ان چند جملوں میں "پیام مشرق" کی شانِ نزول، گوئٹے کے "مغربی دیوان" کی اہمیت، وہ معاشرتی اور تہذیبی حالات جن میں ان دونوں ادبی کتابوں کی تخلیق ہوئی۔ اخلاقی مذہبی، قومی اور ملی اقدار کی شکست و ریخت، ہندوستان اور جرمنی کے حالات کی مماثلت

[1] مقالات اقبال (جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ) ص ۲۰۷۔

مشابہت، ایک بڑے تہذیبی اور تمدنی انقلاب کی ضرورت اور اہمیت، جنگ عظیم نے انسانیت کو جس آشوب قیامت سے دوچار کیا اس کی وضاحت اور پھر ان سب کے اثرات کی جھلک جس طرح اس دور کے فلسفیوں، عالموں اور سائنس دانوں کے افکار و خیالات میں رونما ہو رہی ہے۔ علامہ نے ان تمام موضوعات کی تفصیلات و جزئیات کو ان چند جملوں میں کچھ اس طرح سمو دیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کو یہ گر خوب آتا ہے کہ وہ بے جا تفصیل میں نہیں جاتے۔ اہم موضوعات کو تفصیل و جزئیات کے بجائے ایجاز و اختصار لیکن ایک مربوط کیفیت کے ساتھ پیش کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتے ہیں، اور ان کی نثر اسی خصوصیت سے پہچانی جاتی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ کا علم، جو بہت وسیع و عریض ہے، ان کی شخصیت کا اس طرح جزو بن گیا ہے کہ ان کی کہی ہوئی ہر بات وزنی اور ٹھوس ہونے کی وجہ سے مختصر لیکن جامع معلوم ہوتی ہے۔

ادب و شعر کے مختلف موضوعات پر انھوں نے جو نکتے اپنی نثری تخلیقات میں پیدا کئے ہیں وہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور انھیں نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کا نثر نگار بلکہ ایک بلند پایہ نقاد بھی ثابت کرتے ہیں۔

۵

علامہ اقبال نے اپنی نثر میں معاشیات، فلسفہ، نفسیات، تہذیب و ثقافت اور ادب و شعر کے ساتھ ساتھ زندگی کے عام حالات اور معاملات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ انسانی زندگی میں جو خوبصورتی ہے، انسانی رشتوں میں جو حسن ہے، جذباتی معاملات میں جو لطافت ہے۔ ان کو بھی اقبال نے اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ ان پہلوؤں کی ترجمانی

میں اقبال ایک مفکر، عالم اور نقاد کی سطح سے ذرا نیچے بھی اترے ہیں اور انھوں نے انسانی زندگی کے عام پہلوؤں سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ جب وہ اس منزل میں پہونچتے ہیں تو ان کی نثر حسن وجمال اور لطافت وپاکیزگی کی انتہائی بلندیوں تک رسائی حاصل کرلیتی ہے اور اس میں ذوق جمال کو تسکین پہونچانے کی صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔ یہ کام ان کے ہاتھوں بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے۔

مقدار میں اس قسم کی نثر اقبال کے ہاں ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس سلسلے کے سب سے زیادہ اہم تو ان کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے انگلستان سے "اخبار وطن" کے ایڈیٹر کو لکھے اور جو اب "مقالات اقبال" میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان بے شمار خطوط میں بھی ان موضوعات کی ترجمانی جگہ جگہ ملتی ہے جو انھوں نے اپنے بے تکلف احباب کو لکھے ہیں اور جو اب ان کے مکاتیب کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔ ان خطوط کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال ایک عظیم انسان تھے۔ انھیں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے گہری دلچسپی تھی معمولی باتوں سے بھی وہ لطف اندوز ہوتے تھے اور ان کا ذکر اس طرح ڈوب کر کرتے تھے کہ شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی حسن وجمال کی دنیائیں آباد ہوجاتی تھیں۔ یہ رومانیت کی دین تھی جس نے اقبال کی نثر کو جذبے اور تخیل کے رنگ میں رنگ کر رومانی نثر کا شاہکار بنادیا۔

"اخبار وطن" کے ایڈیٹر کے نام پہلے خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"مخدوم ومکرم مولوی صاحب۔ السلام علیکم

آپ سے رخصت ہوکر اسلامی شان وشوکت کے اس قبرستان میں پہونچا جسے دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا۔ ازاں بعد حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن

وہیں بسر کیا۔

اللہ اللہ! حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا۔ اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ اس خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں۔ بالخصوص اس نے جب یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوح مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔"[1]

اس مختصر سے اقتباس میں علامہ اقبال نے اپنی روداد سفر کا صرف ایک پہلو پیش کیا ہے لیکن دوستوں کی ملاقات سے انھیں جو لذت حاصل ہوئی، حضرت

---

[1] مقالات اقبال صفحات ۶۳ - ۶۴ (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۴ پر ملاحظہ ہو)

محبوب الٰہیؒ اور ان کے دربار سے انھیں جو عقیدت ہے، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ سے جو محبت ہے، انیسویں صدی میں اسلامیانِ ہند کی جذباتی اور جمالیاتی زندگی کے سب سے بڑے ترجمان غالب سے جو الفت ہے اور ان کے کلامِ حقیقت ترجمان سے جو رغبت ہے، اور اس کو سن کر آنکھوں کو پرنم کرنے اور آنسو بہانے کی جو کیفیت ہے، اس کو علامہ نے جس طرح ان جملوں میں سمویا ہے، اس نے اس نثری تحریر کو الفاظ کی مصوری کا ایک شاہکار بنا دیا ہے۔

اب ایک اجنبی شخص کی تصویر دیکھیے جو علامہ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازے سے زیادہ ہو گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان

(ص ۱۶۳ کا بقیہ حاشیہ)

"گورستانِ شاہی" علامہ کی مشہور نظم ہے۔ غالباً وہ اسی موقع پر تخلیق ہوئی۔ اس کے یہ چند اشعار علامہ کی اس نثری تحریر کا عکس معلوم ہوتے ہیں:

سرزمین دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی، اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب! ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اس کا شوق کرو۔ ذرا مسکرایا، کچھ پئے ہوئے بھی تھا، بولا: ع

سراب شوک پینے سے سبھی گم دور ہو جانے

میں نے سن کر کہا 'واہ رے بڈھے! خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کی کھیت باڑی میں بکتا پھرے۔"[1]

موضوع اور معنویت کے اعتبار سے جو پہلو دار کیفیت علامہ اقبال نے اس اقتباس میں پیدا کر دی ہے وہ ان کو رومانی انداز کا ایک منفرد نثر نگار ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اب مناظر کی تصویر کشی کے چند نمونے دیکھئے جو علامہ کی اس قسم کی نثری تحریریں کی جان ہیں اور ان میں ان کی نثر کا رومانی رنگ و آہنگ اپنے شباب پر نظر آتا ہے:

"غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے۔ بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو، فوراً ملے گی۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی، یعنی فراغت۔"[2]

"جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں، اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آجاتا ہے۔ ایک روز ایک افسر تختۂ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا ادھر سے گزر ہوا۔ اتفاق سے یا غالباً ارادۃً یہ عورت اس افسر کے شانے پر ہاتھ

۱۔ مقالاتِ اقبال، ص ٦۵

۲۔ مقالاتِ اقبال، ص ٦٨

رکھی ہوئی گزری۔ ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے"۔[1]

"سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے، اور موجیں زور زور سے اٹھتی ہیں۔ ان کو سفید جھاگ چاندی کی کلغی سے پہنا دیتا ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے سے بکھیر ڈالے ہیں"۔[2]

"آج ۱۲ ستمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسا ہمارا دریائے راوی۔ شاید صبح کے پر تاثر نظارے نے اسے سمجھا دیا ہے کہ سکون قلب بھی ایک نایاب شے ہے۔ ہر وقت کی الجھن اور بیتابی اچھی نہیں۔ طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لئے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ:

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے، میں ان کو قابل معذوری سمجھتا ہوں۔ ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھئے
تصویر کس کی ہے ورق آفتاب میں"[3]

"یہاں جو پہونچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختۂ جہاز پر تین اطالین عورتیں

---

[1] مقالات اقبال، ص ۷۰

[2] مقالات اقبال، ص ۷۱

[3] ایضاً ص ۷۲

اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی، جس کی عمر چودہ سال کی ہوگی، نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانتداری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لئے اثر کیا لیکن جب اس نے چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہوگیا، کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو، بدصورتی سے بدتر ہو جاتا ہے۔"[۱]

ان اقتباسات میں زیادہ تر مناظر فطرت کے حسن کا بیان ہے اور ان سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ملتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ زندگی کے خوبصورت پہلوؤں سے اپنے احساس اجمال کی تسکین کا سامان ڈھونڈ نکالتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں زندگی کے بعض حقائق بلکہ سنگین حقائق کا احساس بھی موجود ہے۔ مثلاً پہلے اقتباس میں بھی شہر کی خوبصورتی کے بیان کے ساتھ انھیں یہ احساس بھی ہے کہ اس شہر میں باوجود اس حسن وجمال کے فراغت نصیب نہیں۔ دوسرے اقتباس میں تہذیب اور شائستگی کا خیال۔ تیسرے اقتباس میں تصویر آفتاب کے ساتھ ناسخ کی یہ ہم نوائی کہ ورق آفتاب میں کسی اور کی تصویر بھی نظر آتی ہے اور آخری اقتباس میں نوجوان لڑکی کے حسن سے متاثر ہونے کے باوجود اس کے پیسے مانگنے سے طبیعت کا منغض ہونا اس حقیقت کو صحیح ثابت کرتا ہے کہ اقبال نے جس موضوع کو بھی پیش کیا ہے وہ صرف نظرت کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ کچھ اور حقائق بھی ہیں۔ لیکن بہرحال اس قسم کی نثر کو مناظر کی خوبصورتی کے احساس نے حسین بنایا ہے۔

علامہ اقبال نے انسانی رشتوں سے متعلق بعض موضوعات کو مزاحیہ انداز میں بھی پیش کیا ہے خصوصیت کے ساتھ ان کے خطوط میں یہ پہلو کہیں کہیں خوب نمایاں ہوا ہے

۱۔ مقالاتِ اقبال، ص ۷۹

خاص طور پہ مولانا گرامی کو جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں ان میں اکثر مزاحیہ انداز کی وجہ سے شگفتگی اور شادابی نمایاں نظر آتی ہے۔ اس انداز کے ساتھ جو حقائق انھوں نے پیش کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل اقتباسات میں پوری طرح اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں:

"مخدومی جناب مولانا مولوی گرامی صاحب۔
آپ کا تخلص گرامی کی جگہ نومی ہونا چاہئے کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ راون لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں" ۱

"آپ کہاں ہیں، حیدرآباد میں یا عدم آباد میں؟ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجئے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گذر گئیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا" ۲

"جناب مولانا گرامی
کیا خوب! گرامی تو اقبال کو پورا سال ستاتا رہا اور اقبال ایک ہی خط سے آجائے! یہ کیونکر ممکن ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ شاعر جس قدر بلند نظر ہوگا، اسی قدر سادہ دل بھی ہوگا حضرت! یہ توقع آپ کی مبنی بر انصاف نہیں۔ پہلے آپ لاہور تشریف لائیے، پھر اقبال بھی جالندھر آئے گا" ۳

بے تکلفی نے ان نثری تحریروں میں نہایت ہی لطیف مزاحیہ انداز پیدا کر دیا ہے۔ یہ انداز دوستی کے رشتوں کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اس لئے ان سے اقبال اور گرامی

۱۔ مکاتیب اقبال۔ ص ۹۶
۲۔ ایضاً۔ ص ۹۷
۳۔ مقالاتِ اقبال۔ ص ۱۵۷

دونوں کی شخصیت کے انسانی پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے

غرض یہ کہ اقبال کی نثر میں بہ اعتبار مضامین و موضوعات گہرائی بھی ہے اور پختگی بھی۔ اور انھوں نے اس گہرائی اور پختگی کے ساتھ قومی و ملی، معاشرتی و تہذیبی، لسانی و ادبی اور عام انسانی موضوعات کی ترجمانی بڑی سلیقہ شعاری کے ساتھ اپنے مضامین نثر میں کی ہے۔ ان موضوعات کو پیش کرتے ہوئے اقبال نے سیدھا سادہ لیکن پرکار انداز اختیار کیا ہے، جس میں حقیقت پسندی اور رومانیت آپس میں اس طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

۶

علامہ اقبال کے موضوعاتِ نثر کی یہ تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اقبال ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے نثر نگار بھی تھے۔

یہ صحیح ہے کہ انھیں نثر نگاری کی طرف پوری توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ چونکہ ان کی زندگی کے شب و روز شاعری کی تخلیق میں گذرے اس لئے ان کی نثری تصانیف تعداد میں کم ہیں۔ "علم الاقتصاد" کے علاوہ انھوں نے مختلف اوقات میں صرف مضامین و مقالات لکھے ہیں جو "مخزن" اور دوسرے اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اور اب کتابی صورت میں "مقالاتِ اقبال" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کے ذاتی خطوط کی تعداد خاصی ہے اور ان خطوط کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں وہ اردو نثر کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ وہ نہ صرف علامہ اقبال کی عظیم شخصیت کا آئینہ ہیں بلکہ انھیں ایک منفرد نثر نگار اور اس فن کا ایک صاحبِ طرز انشاپرداز بھی ثابت کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی نثر نگاری کا آغاز ایک اہم علمی موضوع یعنی اقتصادیات

سے کیا اور اس موضوع پر نہایت اعتماد کے ساتھ قلم اٹھایا۔ اگرچہ اس سے قبل اقتصادیات کے موضوع پر اردو زبان میں نثر لکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اقبال نے اس موضوع پر آسان، رواں اور مربوط نثر لکھی اور اس طرح ایک خالص علمی موضوع پر نثر لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو اردو نثر کی روایت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے تعلیم، نفسیات، فلسفہ، عمرانیات، تہذیب و تمدن، زبان اور ادب و شعر کے موضوعات پر جو کچھ مضامین، مقدموں اور دیباچوں کی صورت میں لکھا، وہ بھی اردو میں نئی چیز تھی۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید احمد خاں ان موضوعات پر لکھنے کا آغاز کر چکے تھے اور ان کے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں ان موضوعات پر مختلف مضامین خاصی تعداد میں شائع ہو چکے تھے۔ لیکن جو گہرائی ان موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں اقبال نے پیدا کی، وہ انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال ایک بڑے مفکر اور عالم تھے اس لئے علمی موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں گہرائی تو ان کے ہاں پیدا ہونی ہی چاہیئے تھی اور وہ ان کی نثر میں موجود ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ایک شاعر بھی تھے، چنانچہ شاعری کے اثر سے ان کی علمی نثر میں ایک خاص شان پیدا ہو گئی ہے جس نے اس کو جاذب نظر اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ علمی موضوعات کو پیش کرنے میں جو گلکاریاں علامہ اقبال نے اردو نثر میں کی ہیں وہ اسی صورت حال کا نتیجہ ہیں اور اس کیفیت نے ان کی عالمانہ نثر میں بھی رس پیدا کر دیا ہے۔

شاعر ہونے کا ایک اثر یہ بھی ہوا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی نثر میں انسانی زندگی کے لطیف پہلوؤں کو بھی جگہ دی ہے اور انسان اور انسانی رشتوں سے متعلق موضوعات کو نہایت لطیف انداز بیان کے ساتھ نثر کی صورت میں پیش

کیا ہے۔ ان کی نثر کے یہ حصے تخلیقی نثر کے بہت ہی اچھے نمونے ہیں۔

غرض یہ کہ علامہ اقبال کی نثر نے اپنے دامن میں مختلف اور متنوع موضوعات کو جگہ دی ہے اور اپنے مخصوص اندازِ نگارش کے ساتھ ان کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی نثر نگاری ایک اچھا خاصا نگار خانہ بن گئی ہے۔

پانچواں باب

علامہ اقبال کا اسلوبِ نثر

اسلوب کے بارے میں جتنی باتیں بھی آج تک کہی گئی ہیں، ان میں یہ خیال مشترک ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جس کو انسان اور انسانی شخصیت کا آئینہ کہنا چاہیئے۔ بوفان (BUFFONT) نے جو یہ کہا ہے کہ اسلوب خود انسان ہے، اور اسٹنڈال نے جو یہ بات واضح کی ہے کہ اسلوب ان تمام حالات و واقعات سے تشکیل پاتا ہے جن میں سے ہو کر لکھنے والے کو گزرنا پڑتا ہے اور جو اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، وہ بالکل صحیح ہے۔ ہر لکھنے والا اپنے اسلوب میں اپنی پوری شخصیت کو پیش کر دیتا ہے۔ اگر وہ شخصیت کو پس پردہ رکھنا بھی چاہے اور نفیِ شخصیت کے نظریے کا قائل ہو تب بھی اس کے اسلوب میں کسی نہ کسی زاویے سے اس کی پوری شخصیت کا عکس نظر آجاتا ہے۔ وہ شعوری طور پر چاہے بھی تو اس صورتِ حال سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔

یہ اسلوب دو بنیادی چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔ ایک تو خیال یا تجزیہ جس میں لکھنے والے کی پوری شخصیت ظاہر ہوتی ہے، دوسرے اس تجربے کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کا استعمال۔ اسی لئے تو یہ کہا گیا ہے، اور اس بنیادی خیال سے

سب ہی متفق ہیں، کہ اسلوب درحقیقت شخصیت ہے جو الفاظ کا لباس پہن کر جلوہ نما ہوتی ہے، اور وہ کردار اور اس کی خصوصیت ہے جس کا اظہار گفتگو اور بات چیت میں سمجھ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب میں لکھنے والے کی شخصیت اور اس کی تمام خصوصیات یکجا ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس اسلوب سے پڑھنے والا نہ صرف لکھنے والے کو پہچانتا ہے بلکہ اس کے شعور اور تحت شعور میں جو بے شمار لہریں اٹھ رہی ہوتی ہیں، ان سے آشنا ہو جاتا ہے۔

اور یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لکھنے والا اپنے اسلوب کے ذریعے سے اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ خیالات و نظریات درحقیقت لکھنے والے کے جذباتی اور ذہنی تجربات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ان تجربات کو مناسب اور متناسب الفاظ کے استعمال کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرتا ہے کہ اس میں اظہار و ابلاغ کے ساتھ حسن و جمال کی اقدار نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ جب اسلوب کی تخلیق کا عمل اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تب اس میں وہ صورت پیدا ہوتی ہے جس کو بعض نقادوں نے CHRYSTALLISATION کے عمل کا نام دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ CHRYSTALLISATION کا یہ عمل نہایت پیچیدہ ہے۔ اس میں موضوع کی نوعیت، خیال کی کیفیت، جذبے اور شعور کی حالت مل کر الفاظ اور زبان کے استعمال کی محرک ہوتی ہے، اور اس کے نتیجے میں ایک مخصوص آہنگ پیدا ہوتا ہے، ایک مخصوص نغمگی اور موسیقیت وجود میں آتی ہے، مخصوص علامتیں تشکیل پاتی ہیں اور مخصوص تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اور یہ سب مل کر ذہن اور دل و دماغ پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ انسان ان کی ساحری سے مسحور ہو جاتا ہے۔

اور یہی اسلوب کا اصل مقصد اور صحیح دائرۂ کار ہے۔

۲

علامہ اقبال نے، جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب نثر میں بھی یہی خصوصیات پیدا کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نثری اسلوب بھی اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتا ہے جو ان کی شخصیت کا آئینہ ہے، ان کے کردار کی صحیح تصویر ہے، ان کے خیالات و نظریات کا عکس ہے، ان کے ذہنی رجحانات کا سایہ ہے اور ان کی شخصیت ہی کی طرح جان دار اور پختہ ہے۔ اس میں وہی رنگ و آہنگ نظر آتا ہے جو ان کے ذہنی اور جذباتی تجربات میں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں جو لہریں شعور اور تحت شعور میں اٹھ رہی ہیں، ان کی پرچھائیاں ان کے اسلوب پر بھی پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کا ہیولا بے شمار رنگوں سے تیار ہوا ہے اور یہ رنگ علامہ اقبال کی پہلودار متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے رنگ ہیں اسی کا یہ اثر ہے کہ علامہ کا اسلوب ان بے شمار رنگوں کی ایک قوسِ قزح کے روپ میں اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔

اس اسلوبِ نثر کا منبع علامہ کے تجربات ہیں۔ اس کی بنیاد ان کے وہ خیالات و نظریات اور عقائد و تصورات ہیں جو ان کی شخصیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں اور جنھوں نے علامہ اقبال کو ایک مفکر بھی بنایا ہے اور ایک فنکار بھی۔ یوں علامہ اقبال نے اپنے فلسفے میں جذبے کو بڑی اہمیت دی ہے، اس لئے "عقل کے مقابلے میں عشق ان کے ہاں غالب نظر آتا ہے۔ لیکن ایک مقام ان کے ہاں ایسا بھی آتا ہے جہاں وہ عقل کو جذبے پر ترجیح دیتے ہیں اور وہ فنون لطیفہ کی تخلیق ہے۔ "ضربِ کلیم" میں انھوں نے ادبیات کے متعلق ایک قطعہ درج کیا ہے جس میں عشق کو عقلِ خداداد کی پیروی کرنے کی

تلقین کی ہے تاکہ وہ کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کر سکے اور اس کے لئے کہنہ روح کو تقلید سے آزاد کرنے کا موقع فراہم ہو:

عشق اب پیروی عقلِ خداداد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یاکہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

یہ قطعہ معنویت سے بھرپور ہے اور فنونِ لطیفہ کے متعلق علامہ اقبال کے بنیادی نظریے کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ اسلوب فنِ لطیفہ کی روح ہے اور اس کی تشکیل میں عقل اور ذہن وشعور کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے سہارے اس کے اظہار وابلاغ میں شعور کی حکمرانی کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب کی تشکیل فن کار کے ہاں صرف اضطراری طور پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کے پیکر کو تراشنے میں اپنے شعور سے بھی کام لیتا ہے۔ گویا ایک تنقیدی زاویۂ نظر کے ہاتھوں اس اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کے اسلوبِ نثر میں یہ صورت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے جذباتی انداز کی نثر نہیں لکھی ہے۔ برخلاف اس کے عملی طور پر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ نثر ایک ایسا فن ہے جس میں صرف جذباتی انداز سے کام نہیں چلتا۔ اس کو تو عقل وشعور کا دامن پکڑ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ یہی بات اس کو اپنے فنی حدود میں رکھتی ہے اور فن کی پابندیوں تک پہنچاتی ہے، کیونکہ اس طرح اس میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہوتا ہے، ایک سنبھلی ہوئی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اور ایک لغزشِ مستانہ اور جراُتِ رندانہ کے ساتھ ایک طرزِ حکیمانہ کی سنجیدگی اپنی جھلکیاں دکھانے لگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال کے اسلوبِ نثر میں ایک

والہانہ انداز کے ساتھ ایک مفکرانہ رکھ رکھاؤ اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر، ایک فلسفی، ایک سیاسی رہنما، ایک ماہر تعلیم، ایک دینی عالم، ایک ادبی محقق اور نقاد تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ عہد قدیم سے موجودہ دور تک کے تقریباً تمام فلسفی ان کے مطالعے میں رہے تھے۔ ساتھ ہی نفسیات، سائنس اور سماجی علوم کے ماہرین کی تحریریں بھی ان کے سامنے رہی تھیں اور مذہبی اور دینی علوم کے علمبرداروں کو بھی انھوں نے بغور پڑھا تھا۔ نیز ادب و شعر سے دلچسپی لینے والے محققوں اور نقادوں کی تحریریں بھی ان کے پیش نظر رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کا کم اور کسی کا نسبتاً زیادہ اثر علامہ اقبال کے ہاں موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے خیالات یا تحریر کے انداز سے انھوں نے کوئی ایسا اثر قبول نہیں کیا ہے جو کسی خاص رجحان کی صورت میں ان کے ہاں نمایاں ہو۔ البتہ ان سب کی تحریروں کے مفکرانہ انداز، فلسفیانہ تحلیل اور منطقی اظہار کے اثرات مجموعی طور پر ان کے ہاں ضرور ملتے ہیں اور وہ جو ایک گہرائی اور پختگی، باقاعدگی اور استواری ان کے اسلوب نثر میں نمایاں ہے، وہ انھیں مفکروں، فلسفیوں، مؤرخوں، سائنس دانوں، ادیبوں اور نقادوں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

علامہ اقبال نے جس وقت لکھنا شروع کیا ہے، اس وقت سرسید احمد خاں کی تحریک کے اثرات اردو نثر کی روایت پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ سرسید نے انیسویں صدی کے آخر اردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا تھا اور مختلف علوم کے لوگوں تک پہنچانے کے لئے ایک ایسے اسلوب نثر کی داغ بیل ڈالی تھی جو کسی حد تک خشک اور سنگلاخ ضرور تھا لیکن عام ہونے کی خصوصیت بھی اس میں بہر صورت موجود تھی۔ وہ مقصدی تھا اور اس میں افادیت کے

خیال کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقا مولانا حالی، مولانا شبلی مولانا نذیر احمد، محسن الملک، وقارالملک، مولانا چراغ علی سب کے سب اسی اسلوب کے علم بردار تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا اسلوب اس اسلوب سے مختلف تھا۔ اس میں زیادہ رنگینی اور پرکاری تھی لیکن افادیت کا خیال اس میں بھی موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سرسید اور ان کے رفقا کے اسلوب کی سی سنجیدگی اور باقاعدگی نہیں تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ آزاد سرسید سے زیادہ قریب نہیں تھے۔ ادب اور شاعری کے چسکے نے ان کے اسلوب میں وہ رعنائی پیدا کر دی تھی جو سرسید کے اسلوب میں نہیں تھی۔ بہرحال علامہ اقبال اس ماحول سے ضرور متاثر ہوئے جو سرسید کے زیر اثر اردو نثر میں پیدا ہوا تھا اس لئے علمی موضوعات کو سنجیدہ اسلوب نثر میں پیش کرنے کا تجربہ ان کے ہاں کامیاب رہا اور انھوں نے اس تجربے کو اُردو کی سنجیدہ نثر کی روایت کا جز بنا دیا۔

سرسید کی تحریک سے ملتی جلتی "مخزن" کی تحریک تھی جس کے سب سے بڑے علم بردار سر شیخ عبدالقادر تھے جنھوں نے اردو میں ایک نئے اسلوب نثر کی بنیاد رکھی اور ایسے لکھنے والوں کو اپنے آس پاس جمع کیا جنھوں نے سرسید کے اسلوب نثر میں تھوڑا سا رومانی رنگ بھر کر ایک نئے اسلوب کو پیدا کرنے کا تجربہ کیا۔ علامہ اقبال "مخزن" کی اس تحریک کے ساتھ پوری طرح وابستہ رہے، اس لئے اس تحریک کے زیر اثر اسلوبِ نثر کے جو رجحانات پیدا ہوئے، ان کا اثر علامہ نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ ان کی بہت سی نثری تحریروں میں اس اسلوب نثر کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔

یہ اثرات علامہ اقبال کے اسلوب نثر میں موجود ہیں لیکن انھوں نے ان سب کے امتزاج سے اپنی انفرادیت کی تشکیل کی ہے۔ اس لئے اپنے عہد کے ان

اسالیب نثر سے متاثر ہونے کے باوجود انھوں نے اپنا ایک ایسا اسلوب بنایا ہے جس میں ان کی انفرادیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

۳

سب سے پہلے تو ان کی یہ انفرادیت اس اسلوب میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے جو انھوں نے معاشی اور اقتصادی موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ ایسے علمی موضوع کو اردو میں پیش کرنے کی روایت اس سے قبل موجود نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج میں علمی موضوعات کو اردو نثر میں پیش کرنے کے تجربے ہو چکے تھے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے بھی اسکی طرف توجہ کی تھی لیکن کوئی باقاعدہ ضخیم تالیف اس موضوع پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ علامہ اقبال نے سب سے پہلے اقتصادیات پر ایک باقاعدہ تالیف پیش کی اور اس میں ایک ایسا اسلوب نثر اختیار کیا جو اس موضوع کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اس اسلوب نثر کے متعلق علامہ اقبال دیباچے میں لکھتے ہیں :

"زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصول کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اردو زبان میں اس متین طرزِ عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی کی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر بامذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانۂ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے، ساتھ ہی اسکی

تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورے کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً سرمایہ، سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت، محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو بامذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔" ؎۱

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال جس وقت اس موضوع پر قلم اٹھا رہے تھے اس وقت بھی ان کے پاس زبان کے استعمال اور طرز عبارت کی تشکیل کا شعور موجود تھا۔ یہ محض ان کی عاجزی اور انکساری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہل زبان نہیں سمجھتے، حالانکہ زبان پر جس قدرت کا اظہار عملی طور پر انھوں نے کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اہل زبان ہیں بلکہ اس زبان میں مشکل سے مشکل علمی موضوعات کو ظاہر کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کو تخلیق کرنے کا تجربہ نہ کر پاتے جو انھوں نے مغرب میں علمی موضوعات پر لکھی جانے والی نثر کے زیر اثر کیا ہے۔ علمی اصطلاحات کی اہمیت کا بھی انھیں اندازہ نہ ہوتا۔ فارسی محاورات کا ترجمہ کرنا بھی ان کے بس کی بات نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ جو علامہ اقبال نے کیا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ اردو زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور انھوں نے انگریزی، عربی اور فارسی کے مختلف اسالیب کو سامنے رکھ کر اردو میں علمی نثر لکھنے کی نئی طرح ڈالی ہے اور اس طرح ایک نئے اسلوب نثر کا تجربہ کیا ہے، جو اردو کی نثری روایت میں

؎۱۔ علم الاقتصاد، ص ۲۵

خاص اہمیت رکھتا ہے۔

لیکن اقتصادیات کے ایسے موضوع پر لکھتے ہوئے انھوں نے صرف متین طرز عبارت، علمی اصطلاحات اور محاوروں کے تراجم ہی کا خیال نہیں رکھا ہے بلکہ مجموعی طور پر ایک ایسے اسلوب نثر کی تشکیل کی ہے جو علمی مسائل اور ان کے اسرار و رموز کے اظہار و ابلاغ کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی پختگی اور روانی، ایک خاص طرح کی مصورانہ تصویر کشی کے ساتھ مل کر ایک طرح کی جمالیاتی شان پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً یہ عبارت دیکھیے:

"علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج، اس کے اوضاع و اطوار اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روز مرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی تو اے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّیٰ آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے

کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے بعلّم اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظام عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"[1]

اس عبارت میں پختگی اور روانی، صفائی اور سادگی، وضاحت اور صراحت کی وہ خصوصیات ہیں جو علمی تحریروں کو زندہ اور جان دار بناتی ہیں۔ علامہ اقبال کے اسلوبِ نثر میں ان خصوصیات کو مغرب کی فلسفیانہ اور فکری تحریروں کے وسیع اور گہرے مطالعے نے پیدا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس عبارت میں روزمرہ اور محاورے کا صحیح اور برمحل استعمال بھی ملتا ہے۔ زبان پر قدرت بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے مفہوم پوری طرح واضح ہوتا ہے اور موضوع کا ابلاغ بھی پوری طرح ہو جاتا ہے لیکن اس ابلاغ میں کچھ ایسی تصویریں بھی ابھرتی ہیں جو علامہ کے اسلوب کو زندگی سے معمور کر دیتی ہیں۔ مثلاً تاریخ انسانی کے ساتھ سیلِ رواں، زندگی کے دھندے کے ساتھ ظاہری اور باطنی قویٰ کو چپکے چپکے

---

[1] علم الاقتصاد (دیباچۂ مصنف)، ص ۲۳

اپنے سانچے میں ڈھالنے اور گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں اور مفلسی کو صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی تصویریں اقبال کے اسلوب نثر کو ایک خاص قسم کی گہرائی (DEPTH) سے آشنا کرتی ہیں۔ ان سے علمی مفہوم بھی واضح ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے حواس بھی ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ الفاظ کا صوتی آہنگ اس تاثر میں سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور اس طرح اس میں زیادہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ علامہ اقبال نے "علم الاقتصاد" لکھ کر اردو میں علمی نثر لکھنے ایک نیا تجربہ کیا اور ایک ایسے اسلوب نثر کی داغ بیل ڈالی جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے، اور جس نے ان کو، جہاں تک علمی نثر لکھنے کا تعلق ہے، ایک منفرد اور صاحب طرز انشاپرداز بنا دیا ہے۔

۴

اس میں شبہ نہیں کہ اقتصادیات کے موضوع پر علامہ اقبال کی یہ تالیف "علم الاقتصاد" ان کے عالمانہ اسلوب نثر کا بہت ہی اچھا نمونہ ہے۔ اردو میں نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال ملتی ہے، نہ اس کے بعد۔ یہ ایک علمی اور فنی موضوع تھا اس لئے اس کو پیش کرنے کے لئے ایسا پختہ، شگفتہ اور رواں اسلوب نثر، جس سے علامہ اقبال نے کام کیا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کو صرف علامہ اقبال ہی انجام دے سکتے تھے کیونکہ ان کی شخصیت میں بعض ایسے پہلو نمایاں تھے جن کے بغیر اس قسم کے اسلوب نثر کی تشکیل و تعمیر ناممکن سی بات ہے۔

علامہ اقبال نے نثر لکھنے کا آغاز تو اسی کتاب "علم الاقتصاد" سے کیا لیکن اس کے بعد وہ مختلف موضوعات پر علمی نوعیت کے مضامین لکھتے رہے۔ ان

مضامین میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کا یہ اسلوب نثر کچھ زیادہ ہی نکھرتا گیا اور اس میں پختگی اور استواری کچھ زیادہ ہی پیدا ہوتی گئی۔ اُن کے ان مضامین و مقالات میں، جو انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف علمی موضوعات پر لکھے۔ یہ اسلوب نثر اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

اس اعتبار سے ان کا مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت" بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس مضمون میں علامہ اقبال نے بچوں کی نفسیات اور ان کی زندگی کے عام مسائل، خصوصاً تعلیم و تربیت کے مسائل، کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بچوں کی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"سچ پوچھئے تو قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریقِ تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام تمدنی شکایات کا فور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثنا خواں بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لئے اس کا وجود زینت کا باعث ہو، اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے، اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کے ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینے سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دور کر کے اسے مجلّا اور مصفّا کر دیتی ہے۔"[1]

یہ خاصی مجلّا اور مصفّا نثر ہے۔ یہ مرصع نثر تو نہیں ہے لیکن اس میں سادہ

---

[1] مقالاتِ اقبال (بچوں کی تعلیم و تربیت) ص ۲۔

پرکاری کی جھلکیاں ضرور نمایاں ہیں۔ بچوں کی تعلیم کو قومی عروج کی جڑ کہنا، شکایات کے دور ہونے کے لئے کا فور ہونے کا پیکر تراشنا، انسان کے ہر فعل کو روشنی سے تعبیر کرنا اور اس کی کرنوں کا اثر دیانت داری اور صلح کاری کی صورت میں دیکھنا اور روح کے آئینے کا توہمات کے زنگ سے پاک ہو کر مجلا اور مصفّا حالت میں نظر آنا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ یہاں علامہ اقبال نے اپنے اسلوب نثر میں محدود طریقے ہی سے سہی، لیکن تخیل سے کام ضرور لیا ہے اس لئے جو تشبیہات و استعارات انھوں نے استعمال کئے ہیں اور جو تصویریں انھوں نے تراشی ہیں، ان سب سے مل کر ان کے اسلوب نثر میں ایک سادہ پرکاری کی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔

علامہ اقبال کے اس سنجیدہ لیکن سادہ پرکار اسلوب میں ایک پہلو اور بھی ہے جو ان کے اسلوب نثر کو زیادہ شگفتہ اور شاداب بنا دیتا ہے۔ اپنی بات پڑھنے والوں کے ذہن نشین کرانے کے لئے وہ فلسفہ، نفسیات اور تعلیم کے مسائل تک کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں انداز تخاطب اور جزوی طور پر ایک ڈرامائی انداز سے کچھ ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے موضوع اور انداز دونوں میں ایک جذب و کشش کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔

بچوں میں نقل کرنے کا جو مادّہ ہوتا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بچے میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہمجولیوں کو کہتا ہے آؤ بھئی! ہم مولوی بنتے ہیں،

لہ مقالاتِ اقبال (بچوں کی تعلیم و تربیت) ص ۵۔

تم شاگرد بنو کبھی بازار کے دوکان داروں کی طرح سودا سلف بیچ لیتے،
کبھی پھر پھر کر اونچی آواز دیتا ہے کہ " چلے آؤ انار سستے لگادیئے " اس وقت
میں بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اس کے
ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔ " لے

یہ بات صرف اتنی سی ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں استاد کو اپنی
شخصیت کو مثالی بنا کر دکھانا چاہیئے تاکہ بچہ اس کی اچھائی کی نقل کرے کیونکہ
نقل کرنے کا مادّہ اس کی جبلت میں شامل ہے۔ لیکن علامہ اقبال نے اس نفسیاتی
اور تعلیمی نکتے کو بچوں کے بعض مشاغل کی تصویر کشی کر کے زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔
خاص طور پر اس میں انھوں نے دو ایک مکالموں سے جو ڈرامائی شان پیدا کر دی
ہے وہ اسلوب نثر کے سلسلے میں ان کی فن کارانہ چابک دستی پر صداقت کی مہر
لگاتی ہے۔

لیکن اس انداز سے ان کے اسلوب نثر کی سنجیدگی مجروح نہیں ہوتی۔ برخلاف
اس کے اس انداز سے ان کی معنویت میں وزن پیدا ہوتا ہے اور اظہار و ابلاغ میں
جمالیاتی اقدار نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔

علامہ اقبال اپنے علمی اسلوب نثر میں ان جمالیاتی اقدار کو نمایاں کرنے کا
خاص خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ کہیں تشبیہات و استعارات سے کام لے کر کہیں بعض
تصویروں کی تخلیق کر کے، کہیں لطائف و واقعات کو پیش کر کے اور کہیں تفصیلات و
جزئیات کو جمالیاتی انداز میں بیان کر کے وہ اپنے اسلوب نثر میں بھی ان جمالیاتی
قدروں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے لئے انھیں کوئی شعوری کوشش نہیں کرنی پڑتی،
بلکہ یہ تمام پہلو ان کے اسلوب نثر میں تجربے کی مخصوص کیفیت اور جذبے اور
تخیل کی خاص تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً تشبیہات و استعارات کی چند مثالیں دیکھئے:

"زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسی دشوار گذار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ بقسم بخدائے لایزال! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی علمی کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، ورنہ مجھے زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔"[۱]
(اُردو زبان پنجاب میں)

"برق جس کی مضطربانہ چمک تہذیب کے ابتدائی مراحل میں انسان کے دل میں مذہبی تاثرات کا ایک ہجوم پیدا کر دیا کرتی تھی، اب اس کی پیام رسانی کا کام دیتی ہے۔ نسیم اس کی سواری ہے اور ہوا اس کے پنکھے جھلا کرتی ہے۔"[۲]
(قومی زندگی)

"لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو، منگنی کے بعد تو اس گھر سے ایسا پرہیز کرنا پڑتا ہے جیسے ایک متقی میخانے سے۔"[۳] (قومی زندگی)

"مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اُتار دینے کا نام نجات ہے۔"[۴]
(دیباچہ مثنوی اسرار خودی)

ان اقتباسات میں جو تشبیہات و استعارات ہیں وہ نئے اور اچھوتے ہیں، اور موضوع کی نسبت سے دیکھا جائے تو ان کو استعمال بھی نئے اور اچھوتے انداز سے کیا گیا ہے۔ ان کے استعمال کا بنیادی مقصد تو دراصل خیال یا تجربے کی وضاحت ہے لیکن تخیل کی رنگ آمیزی نے اس میں کچھ ایسی گل کاریاں کی ہیں اور کچھ ایسے رنگ بکھیرے ہیں کہ طبیعت ان سے اثر قبول کرتی ہے اور اس طرح احساس

۱۔ مقالاتِ اقبال (اردو زبان پنجاب میں) ۲۔ ایضاً (قومی زندگی) ص ۴۰ ۳۔ ایضاً ۵۸ ۴۔ ایضاً ۱۵۴

جمال کی تسکین کا سامان پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کے اسلوب نثر میں بعض جگہ تصویر کشی کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ علمی نکتوں کی وضاحت کرتے ہوئے بعض مثالیں دیتے ہیں، واقعات بیان کرتے ہیں یا لطیفے سناتے ہیں تو ایسے مواقع پر اقبال کے ہاں کچھ تصویریں ابھرتی ہیں۔ اقبال کا تخیل ان تصویروں میں جان ڈال دیتا ہے اور وہ منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کی زبوں حالی خصوصاً غربا کی پامالی پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ انھوں نے ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے پورے منظر کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور اس نقشے کو دیکھ کر طبیعت میں رنج وغم کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں، جہاں کی آبادی کا جزو غالب مسلمان ہیں، معمولی درجے کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا۔ لاہور کے کسی اسلامی محلے میں جا نکلو، ایک تنگ و تاریک کوچے پر ہماری نظر پڑے گی جس کے دہشت زا سکوت کے طلسم کو وہ رہ رہ کر یا تو لاغر، نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشیں بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنھوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات

کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں ،، ۱؎ (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر)

اس عبارت سے عام مسلمانوں کی مالی بدحالی اور افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پامالی کی پوری تصویر نہ صرف آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے بلکہ حواس پر چھاجاتی ہے۔ خاص طور پر تفصیل و جزئیات کی وہ تصویریں جن میں علامہ اقبال لاغر اور نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار اور پردہ نشیں بڑھیا کی برقع میں سے نکلی ہوئی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں اور الفاظ میں ان کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ اقبال کو ایسا کرنے میں کمال حاصل ہے۔ نثر میں یہ تصویر کشی درحقیقت وہی محاکات ہے جس کو شاعری میں دیکھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے علمی اسلوبِ نثر میں یہ خصوصیت ان کے شاعرانہ مزاج ہی نے پیدا کی ہے۔

اسلوبِ نثر میں علامہ اقبال کی شگفتہ مزاجی بھی عجیب عجیب گل کھلاتی ہے چنانچہ بعض جگہ وہ اپنے کسی اہم خیال کو واضح کرنے کے لیے یا کسی علمی نکتے کو لوگوں تک موثر انداز میں پہونچانے کے لئے لطیفوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے وہ نام و نمود کی خواہش اور اس کے مذموم اثرات کو (جس نے بیشتر لوگوں میں ایک مرض کی صورت اختیار کرلی ہے) ایک دلچسپ لطیفہ سنا کر واضح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"منجملہ اور قومی امراض کے ایک بے جا نام و نمود کی خواہش کا مرض بھی ہے جو عام طور پر ہمارا دامن گیر ہے۔ مجھے اس وقت ایک معنی خیز لطیفہ یاد آیا جس کو بیان کرنے سے رک نہیں سکتا۔ ہمارے سیالکوٹ کے قریب تحصیل وزیر آباد میں ایک بزرگ کیسر شاہ نام کے رہا کرتے تھے۔ رندانہ طریق کے ایک صاحبِ کرامت درویش تھے اور مراقبہ و وحدت الوجود سے انھیں خصوصیت تھی۔

۱؎۔ مقالاتِ اقبال صفحات ۱۳۲، ۱۳۹

قرب و جوار کے تمام معززین، ہندو اور مسلمان ان کے حلقۂ مریدین میں شامل تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک دیوان صاحب، جو ان کے معتقد تھے، اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی سے فارغ ہو کر حضرت کی زیارت کو آئے اور آتے ہی اپنے نام و نمود کا نقشہ آنا زما شروع کیا۔ وہ بزرگ ان کے اخراجات کی طویل فہرست خاموشی سے سن رہے تھے کہ ایک درویش نے آکر عرض کیا کہ حضرت! کھانا تیار ہے۔ سائیں صاحب نے پوچھا کہ نری خشک روٹی ہے یا سالن بھی ہے؟ درویش نے عرض کیا کہ حضرت! اس وقت سالن موجود نہیں۔ حضرت نے دیوان صاحب سے فرمایا کہ ذرا بازار سے جا کر ایک مولی تو لے آؤ۔ ہمیں یہی سالن کا کام دے گی۔ اتفاقاً دیوان صاحب کی جیب میں اس وقت کوئی پیسہ موجود نہیں تھا۔ ذرا کھسیاتے ہوئے اور سائیں صاحب کے سامنے جو چند کوڑیاں رکھی تھیں انھیں دیکھ کر بولے: "حضرت یہ کوڑیاں دلائیے، میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔" آپ نے فرمایا کہ بیٹے کی شادی پر تم نے جو نام و نمود حاصل کیا ہے وہ دے کے ایک مولی لے آؤ۔ دیوان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے "حضرت! بھلا نام و نمود کے عوض میں بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ آسکتی ہے؟" سائیں صاحب نے اپنے معمولی ظریفانہ طریق میں فرمایا کہ بھائی! جس نام و نمود کی قیمت ایک مولی بھی نہیں پڑتی اس کے حصول سے فائدہ ہی کیا؟ دیوان صاحب نہایت خفیف ہوئے اور آئندہ کے لئے اپنی حرکات سے توبہ کی۔" [1] (قومی زندگی)

اس طرح کے دلچسپ لطیفے یا واقعات علامہ اقبال اسلوب نثر میں نہ صرف دلچسپ فضا پیدا کرتے ہیں بلکہ ان سے کسی اہم نکتے کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ اقبال

---

[1] مقالاتِ اقبال (قومی زندگی) ص ۵۹

کے اسلوب نثر کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ سنجیدہ علمی موضوعات کو بھی دلچسپ اور پُرلطف بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مقصد اس کا یہی ہے کہ ان کے خیالات و تجربات موثر ہوں اور پڑھنے والا ان کو ذہنی طور پر قبول کر کے اپنی شخصیت کا جز بنا لے۔

غرض یہ کہ علامہ اقبال کے علمی اسلوب میں سنجیدگی، باقاعدگی اور منطقیت کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور شادابی کے عناصر بھی ملتے ہیں، جن کو وہ مختلف طریقوں سے پیدا کرتے ہیں۔ کبھی الفاظ کے مخصوص استعمال سے روانی کو پیدا کر کے، کبھی تشبیہات و استعارات سے کام لے کے، کبھی جان دار تصویروں کی تخلیق کر کے اور کبھی دلچسپ لیکن سبق آموز لطیفے سنا کے۔ لیکن اس سے ان کے اسلوب کی سنجیدگی کو ٹھیس نہیں لگتی۔ برخلاف اس کے اس کا تاثر اس انداز کی وجہ سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

۵

سنجیدگی سے ملی ہوئی شگفتگی اور شادابی علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ علمی اور فلسفیانہ موضوعات تک کی ترجمانی میں ان کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ حالانکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے شگفتگی اور شادابی کو پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اقبال نے اپنی نثر میں یہ سنگم بنایا اور اس طرح علمی نثر لکھنے کا نیا تجربہ کیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی شخصیت کی شادابی اور شاعرانہ مزاجی ہے اور دوسرے اس ماحول کا اثر ہے جو اس زمانے کی نثر نگاری میں 'مخزن' کی تحریک کے زیر اثر قائم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول کی محرک رومانیت کی تحریک تھی جس کو افادی رجحان کے ردعمل نے پیدا کیا تھا اور 'مخزن' جس کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔

علامہ اقبال کی علمی نثر میں تو اس انداز کی صرف جھلکیاں موجود ہیں لیکن

ان کی ادبی اور تنقیدی نثر میں تو اس شگفتگی اور شادابی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کیفیت کو اقبال کبھی رومانی شاعروں کا ذکر کرکے، کبھی ان کے خیالات کا تجزیہ کرکے، کبھی ان کے رنگین ماحول کا بیان کرکے، کبھی جذبے اور تخیل کی آمیزش سے ایک رنگین سی فضا پیدا کرکے، کبھی رعنائی سے بھرپور الفاظ کو استعمال کرکے، کبھی اچھوتی تشبیہات اور نئے استعارات سے کام لے کے اور کبھی الفاظ کو تصویروں کا روپ دے کر پیدا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی بہترین نثر یہی ہے۔

"جناب رسالتمآب کا ادبی تبصرہ" علامہ اقبال کا ایک مختصر سا تنقیدی مضمون ہے لیکن اس مختصر سے مضمون میں بھی انھوں نے جو کچھ کہا ہے اور جس انداز سے کہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ سے شادابی ٹپکتی ہے اور ساتھ ہی زندگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربی شاعر عنترہ کے ایک شعر کو پسند فرمایا اس کا ذکر کرکے علامہ اقبال لکھتے ہیں :

" اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور آخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے ۔ اس عرب نے اس شعر میں ایسی کون سی بات کہی تھی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا ایک شعر صحت مند زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں، ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجہ دو جہاں صلعم نے جو اس قدر شعر کی تعریف کی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیات انسانی کے تابع ہے۔ اس پر

فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدء فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی ہے۔ ایک مقصد وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے، یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار۔ ہر انسانی صنعت اس غایتِ آخریں کی تابع اور مطیع ہونی چاہیئے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انھیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں؛ انحطاط اور موت کا پیغام ہے جنت گر کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔" [1] (جناب رسالتمآب کا ادبی تبصرہ)

یہ طویل اقتباس صرف اس خیال سے یہاں دیا گیا ہے کہ اس سے علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی اس خصوصیت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ اس میں حیرت و استعجاب کی وہ آواز ہے جو دلوں میں ولولوں کو جگاتی اور حوصلوں کو بیدار کرتی ہے۔ پھر شاعر نے زندگی کے تصور کو جس طرح حوصلے اور ولولے سے آشنا کیا ہے، اس کی تصویر کشی بھی الفاظ کے نہایت جان دار رنگوں میں ملتی ہے۔ پھر انسان کی غفلت اور تساہل کو جس طرح اونگھنے سے تعبیر کیا گیا ہے اور بے عملی کی جس طرح چنیا بیگم کا عاشق کہہ کر وضاحت کی گئی ہے، اس نے مجموعی طور پر اس عبارت کو خاصا پرکار بنا دیا ہے۔

ایک اور جگہ شاعری اور اس کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اور اس

---

[1] مقالاتِ اقبال (جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ) ص ۱۸۹، ۱۹۰

روشنی میں حافظ کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ اس طرح تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہیں :

"ـــــ شاعری نام ہی اس کا ہے کہ اشیا و مقاصد کو اصلیت سے حسین تر بنا کر دکھایا جائے تاکہ اوروں کو ان اشیا و مقاصد کی طرف توجہ ہو اور قلوب ان کی طرف کھنچ آئیں ۔ ان معنوں میں ہر شاعر جادوگر ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کا جادو کم چلتا ہے کسی کا زیادہ ۔ خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں ۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں ۔"

(اسرار خودی اور تصوف)

یہ تنقیدی جملے خاصے شاداب ہیں ۔ ان میں خود وہ ادبیت ہے جو تنقید کو تخلیق بناتی ہے ۔ اس میں قلوب کے کھنچنے کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے ، شاعر کو جس طرح جادوگر بتایا گیا ہے اور حافظ کی شاعری کو جس طرح ساحری سے تعبیر کیا گیا ہے ، اس نے اس عبارت میں ایسی پرکاری پیدا کی جو دلوں کو متاثر کرتی ہے ۔

اس اسلوب کی ایک مثال اور دیکھیئے : "پیام مشرق" کے دیباچے میں گوئٹے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہونچ چکا تھا ۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی ہنگامہ آرائیوں

سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کر لیا تھا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کر لی۔ مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لئے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب و غریب خیال کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اس کی نثر خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے اور بعض جگہ اس کی قوتِ تخیل کسی خاص مصرع کے اثر سے ایک نئی شاہراہ پر پڑ کر زندگی کے نہایت دقیق اور گہرے مسائل پر روشنی ڈالتی ہے:[1]

(دیباچہ پیام مشرق)

یہ خاص رنگین، پرکار اور شاداب نثر ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع ادبی تنقید ہے لیکن اس میں خشکی، نشتریت اور کاٹ کی وہ خصوصیات نہیں جو عام بیشتر تنقیدی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں تو علامہ اقبال کی شاعرانہ مزاجی نے اسلوب نثر کے لحاظ سے ایک نہایت ہی لطیف سا ماحول پیدا کر دیا ہے اور ایک رنگین سی فضا قائم کر دی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اقبال سب سے پہلے ایک شاعر اور فن کار ہیں۔ اسی لئے اس معاملے میں بھی جذبے کی تحریک ان کے ہاں تخیل کی پرواز سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اور ان کے اسلوب نثر کو نہ صرف ایک ذہنی تجربہ بلکہ ایک جذباتی تجربہ بھی بنا دیتی ہے، جس کے نتیجے میں ان کا اسلوب نثر ایک تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس پر جان مڈلٹن مرے کا یہ خیال صادق آتا ہے کہ اسلوب بہ یک وقت ایک ذہنی اور جذباتی تجربہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کی ادبی اور تنقیدی تحریروں میں اس تجربے کی نہایت ہی

---

[1] مقالاتِ اقبال (اسرار خودی اور تصوف)، ص ۲۰۳

حسین صورتیں نظر آتی ہیں اور اس کی بدولت ان کا اسلوب نثر رنگینی اور رعنائی شگفتگی اور شادابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔

۶

اسلوبِ نثر کی یہ خصوصیت، اس میں شبہ نہیں کہ، علامہ اقبال کی ادبی اور تنقیدی تحریروں میں خاصی نمایاں نظر آتی ہے، لیکن تنقید کے بہرحال اپنے کچھ حدود ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں رنگین اور پرکار اسلوب نثر کا وہ معیار نہیں پیدا ہو سکتا جو ہلکی پھلکی بیانیہ یا ذکائی تحریروں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اقبال کی بیانیہ یا ذکائی نثری تحریریں مقدار میں ایسی کچھ زیادہ نہیں ہیں، پھر بھی ان کے دو مختصر سفرناموں میں جو لندن سے خطوط کی صورت میں لکھے گئے ہیں، اور دوسرے خطوط میں اس اسلوب نثر کے بعض بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان میں رنگین اور پرکار اسلوب نثر اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ کہیں اشیا یا واقعات کے بیان میں، کہیں جذبات و احساسات کی ترجمانی میں، کہیں خیال اور تخیل کی عکاسی میں، کہیں انسانی زندگی کے بعض بنیادی انسانی حقائق کی نقاب کشائی میں، کہیں لطیف انسانی معاملات کی تصویرکاری اور پیکر تراشی میں اور کہیں عام معمولی باتوں سے متعلق لطیف احساس مزاح کی مصوری میں۔ علامہ اقبال کے ہاں اس قسم کے رنگین اسلوب نثر کے بعض بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں۔

اس اعتبار سے علامہ اقبال کے وہ دو خطوط خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں جو لندن کے سفر کے دوران انھوں نے "اخبار وطن" کے ایڈیٹر کو لکھے۔ یہ

خطا اگرچہ مفصل نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود جامع ہیں اور وہ خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

اقبال کی ان نثری تحریروں میں سب سے پہلے ہماری نظر مناظر کی مصوری پر پڑتی ہے۔ مشاہدے اور محسوسات کے امتزاج نے ان مناظر کی ترجمانی میں مصورانہ شان کو پیدا کیا ہے اور اس طرح اس میں تاثر کی ساحری کے اثرات بڑھ گئے ہیں۔

دہلی کے کھنڈروں سے متعلق ایک تاثر کو ان چند جملوں میں علامہ نے کیسی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامن دل کو کھینچتے ہیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں فاتحہ پڑھی۔ داراشکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں میں ھوالموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرتناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔"[1]

آگے چل کر اسی خط میں لندن وکٹوریہ ڈاک کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

"میں بمبئی یعنی باب لندن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لندن کیا ہوگا جس کا دروازہ ایک عظیم الشان ہے ــــ اچھا دیدہ خواہد شد۔ ۷ستمبر کو دو بجے ہم وکٹوریہ ڈاک گھاٹ پر پہونچے، جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سیکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے

---

[1] مقالاتِ اقبال (اقبال کے دو خطوط)، ص۶۔

کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح و سلامت منزل مقصود پہ پہنچا دیں گے۔" [1]

اور سمندر کی کیفیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

"راستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یکسانیت سے اکتانے لگی۔ سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں جو زور سے اٹھتی ہیں ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک کلغی سے پہنا دیتی ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے سے بکھیر ڈالے ہیں۔ یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے۔" [2]

اور سویز کنال کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔ محمد دین فوق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"——— آخر مسلمانوں کے اس گردہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کنال میں داخل ہوا۔ یہ کنال جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ کنال کیا ہے، عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس طرح اس مغربی اختراع نے زمانۂ حال کی تجارت پر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخصیت کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی جس نے حال کی دنیا کی تہذیب و تمدن کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ بعض بعض جگہ تو یہ کنال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں سے گذر سکتے ہیں اور کسی کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پر کر دے تو

---

[1] مقالات اقبال ص ۷۰ - [2] ایضاً ص ۷۱

آسانی سے کر سکتا ہے"۔ ؎۱

ان اقتباسات میں منظر نگاری ہے اور ان مناظر کے نقشے ہیں جن کا علامہ نے مشاہدہ کیا ہے، لیکن کہیں زیادہ کہیں کم، ان میں محسوسات کا عنصر غالب ہے اور یہی خصوصیت ان میں ایک پہلو دار کیفیت کو پیدا کرتی ہے اور اس کے ہاتھوں رنگین اور پرکار اسلوب وجود میں آتا ہے۔ دہلی کے کھنڈروں کا دامن دل کو کھینچنا، ہمایوں کے مقبرے میں داراشکوہ کے مزار کی خاموشی میں کانوں میں ھوالموجود کی آواز کا سُنائی دینا اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک اخلاقی اثر لے کر رخصت ہونا، دکٹوریہ ڈاک میں کھڑی ہوئی کشتیوں کو یہ کہتے ہوئے محسوس کرنا کہ سمندر کی وسعت سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ وہ انھیں صحیح سلامت پہونچا دیں گی، سمندر کے سفید جھاگ کا موجوں کو چاندی کی کلغی سی پہنانا اور سویز کنال کو عرب اور افریقہ کی جدائی اور مشرق و مغرب کا اتحاد تصور کرنا یہ سب باتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ اس اسلوب نثر کا خالق صرف الفاظ ہی سے نہیں کھیل رہا ہے اور صرف مناظر ہی کا مشاہدہ نہیں کر رہا ہے بلکہ محسوسات میں خود سمندر کا سا طوفان اٹھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مناظر کی تصویر کشی میں علامہ کے ہاں جذبے اور تخیل کی حکمرانی نظر آتی ہے اور یہ دونوں عناصر مل کر ان کے بیان میں رنگینی اور پرکاری کے رنگ بھرتے ہیں۔

اب اس اسلوب نثر کے صرف دو اقتباسات اور دیکھئے جن میں مشاہدے کی شدت، جذبے کی ہیجان انگیزی اور تخیل کی بلندی اور بلند پروازی، یہ سب مل کر نہ صرف چند مناظر کو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں بلکہ واردات و کیفیات کی چند ایسی تصویروں کو بھی بے نقاب کر دیتے ہیں جو منہ سے بولتی ہوئی نظر آتی ہیں اور جن میں نثر نگار اپنے خیالات و نظریات، جذبات و احساسات اور ادراک و شعور

؎۱۔ اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۲۶۹۔

کے گہرے رنگ دوڑا دیتا ہے۔ الفاظ، لہجہ اور انداز بیان ان اقتباسات میں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تصویر تو جہاز کے ایک منظر کی ہے جس میں عورتیں اور مرد وائلن بجا رہے ہیں۔ علامہ نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

"یہاں جو پہونچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختۂ جہاز پر تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی، نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانت داری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اسکے حسن نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ پر سخت اثر کیا لیکن جب اس نے چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہوگیا، کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو، بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔"[۱]

یہ ایک منظر کی سیدھی سادی سی تصویر ہے جس میں تخیل کے رنگ زیادہ گہرے نہیں ہیں لیکن یہ تصویر ابھری ہوئی ضرور ہے۔ یہ جان دار ضرور ہے۔ اس میں زندگی اور اس کے بعض سنگین حقائق کے خد و خال بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ اقبال اس میں نظریے اور خیال کا رنگ بھر کر اس کو زیادہ جان دار بنا دیا ہے۔ اس عبارت میں صرف ایک تشبیہہ "استغنا کا غازہ" آتی ہے، باقی تمام عبارت تشبیہات و استعارات سے خالی ہے۔ الفاظ بھی مرصع نہیں ہیں۔ البتہ خیال اور احساس نے اس تصویر کو رنگین بنا دیا ہے۔

دوسرا اقتباس اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائدار، رنگین اور پرکار ہے کیونکہ اس میں جذبہ زیادہ شدید ہے۔ تخیل کی پرواز زیادہ بلند ہے اور اظہار زیادہ

---

[۱] مقالاتِ اقبال، ص ۹۷۔

مرصع ہے۔ لندن کے سفر میں جب عرب کی سرزمین پر علامہ کا جہاز پہونچتا ہے تو ان کے دل میں عقیدت اور جذباتی وابستگی کی ایک لہر سی اٹھتی ہے اور الفاظ اور زبان بلکہ مجموعی طور پر پورے اسلوب کو مرصع، رنگین اور پرکار بنا دیتی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:

"اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہونچے گا ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کر لوں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو اُدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین! خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالکوں نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ مگر اے پاک سرزمین! تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کر لے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے

آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں پہونچوں جہاں کی گلیوں میں بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔" ؎۱

اس میں جذبے کی جو شدت ہے اور تخیل کی جو پہلودار کیفیت ہے اس نے اس نثر کو حد درجہ رنگین بنا دیا ہے اور ساتھ ہی اس میں جولانی کی بجلیاں بھر دی ہیں یہ تو اچھی خاصی شاعری ہے جو نثر میں کی گئی ہے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کو اچھی نثر نہ تصور کیا جائے۔ یہ اعلیٰ درجے کی شاعرانہ نثر ہے اور اس میں اقبال کی شخصیت کا ہیجان اور زیر و بم پوری طرح سمویا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں جو حالات اقبال کے آس پاس موجود تھے اور جن میں خاص ہیجان کی کیفیت تھی ان کے اثرات بھی اس میں نمایاں طور پر جھلک رہے ہیں۔

دراصل اس قسم کی نثر کو اقبال کے ہاں ان رومانی اثرات نے پیدا کیا ہے جو ان کے عہد میں ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں موجود تھے۔ اقبال کے ہاں ابتدا ہی سے اس تحریک کے اثرات موجود تھے اور ان کی علمی نثر تک اس رجحان سے دامن نہیں بچا سکتی تھی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں اقبال کے ہاں اس کا بچپن نظر آتا ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر جوانی آتی ہے اور یہ جوانی دیر تک اقبال کی نثر میں قائم رہتی ہے۔ علمی نثر تک میں اس رجحان کا اثر نمایاں رہتا ہے لیکن جب اقبال بیانیہ یا مکاتیب نثر لکھتے ہیں تو یہ رجحان ان کی نثر میں آسمان پر پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

سرزمین عرب کے بارے میں نثر کا مندرجہ بالا اقتباس اس صورتحال کا ترجمان اور عکاس ہے جس سے علامہ اقبال کے رنگین اور پرکار اسلوب نثر کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔

؎۱ مقالات اقبال، ص ۷۴۔۷۵

۷

علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی جو تنقیدی تصریحات و تفصیلات اب تک پیش کی گئی ہیں، ان کو سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ اقبال نے مختلف موضوعات پر جو نثر لکھی ہے، اس میں موضوعات کی نسبت سے انداز بیان میں تھوڑا سا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی طبیعت کا میلان رنگین اور پرکار اسلوب کی طرف زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال رومانیت کی تحریک کی پیداوار ہیں۔ ان کی شاعری اور ان کی نثر دونوں میں اس رومانیت کے اثرات ابتدا ہی سے ملتے ہیں۔ طبعاً بھی وہ چونکہ رومانی تھے اس لئے انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تخیل سے کام لیا، اور اس کا اظہار بھی تخیل کی رنگینی کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمی موضوعات تک کی ترجمانی میں وہ ایک ایسے اسلوب نثر سے کام لیتے ہیں جس کو ان کا تخیل رنگین اور پرکار بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علمی موضوعات کے اظہار و ابلاغ میں یہ رنگینی اور پرکاری دوسرے موضوعات کی ترجمانی کے مقابلے میں نسبتاً کم نمایاں ہوتی ہے۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال اصولی اور نظریاتی طور پر موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی کے قائل ہیں اور انھوں نے عملی طور پر اس کو اپنے اسلوب میں برتا بھی ہے۔ اس لئے مختلف موضوعات کو پیش کرتے ہوئے وہ اسی اسلوب سے کام لیتے ہیں جو موضوع کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ اور علمی موضوعات کے لئے ان کے ہاں نسبتاً زیادہ سنجیدہ اسلوب نثر ملتا ہے، لیکن ادبی اور تنقیدی موضوعات کے لئے ایسے اسلوب نثر سے کام لیتے ہیں جس میں شعریت

اور ادبیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور ہلکے پھلکے عام انسانی معاملات کی ترجمانی کے لئے وہ ایسا اسلوب نثر استعمال کرتے ہیں جو سنجیدگی سے گراں بار نہیں ہوتا، برخلاف اس کے وہ رنگین اور شگفتہ اسلوب نثر سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں نثر کے کئی اسالیب ملتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اسلوب تو ان کے ہاں ایک ہی ہے جو ان کی شخصیت کا عکس ہے لیکن اس میں موضوع کی مناسبت سے کچھ جزوی تبدیلیاں علامہ اقبال اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے ہاں یک رنگی کی بجائے رنگارنگی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً جہاں جذباتی معاملات کا بیان ہوتا ہے وہاں زور بیان کے نتیجے میں روانی اور بہاؤ کی کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں تخیل کے زیر اثر پیدا ہونے والے معاملات کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں رنگینی اور پرکاری کے اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں اقبال کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ان سب کو اپنے حدود میں رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کا اسلوب نثر موضوع کے ساتھ مناسبت کا صحیح نمونہ معلوم ہوتا ہے۔

زبان و بیان پر علامہ اقبال کو جو قدرت حاصل ہے وہ موضوع اور اسلوب کے درمیان مناسبت پیدا کرنے کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے یوں علامہ زبان پر قدرت رکھنے کے معاملے میں حد درجہ عاجزی اور انکساری سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ وہ زبان پر قدرت نہیں رکھتے اور اس زبان میں گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گذری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ

کرتا ہوں۔ اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے
میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا"۔[1]
حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان کی نثری تحریریں صاف طور پر یہ بتاتی ہیں کہ وہ اُردو
زبان پر پوری گرفت رکھتے تھے اور موضوع کی مناسبت سے زبان کا استعمال ان کا
مزاج بن گیا تھا۔ بڑے سے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ فلسفیانہ، تہذیبی اور
عمرانی، معاشی اور اقتصادی مسائل کو وہ مناسب زبان میں ادا کر سکتے تھے۔
یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ اپنی نثری تحریروں میں اُردو روزمرہ کی محاورے کی
پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور یہ خیال بھی مضحکہ خیز حد تک تنگ نظری پر مبنی
ہے کہ انھوں نے علمی نثر اس لئے اچھی لکھی کہ وہ اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے
روزمرہ اور محاورہ کا استعمال فطرتاً اور طبعاً نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کے جہل
خیالات ظاہر کرنے والوں کو اقبال کی عظمت کا احساس ہونا چاہئے۔ درحقیقت
اُردو زبان کے ساتھ انھیں دلی لگاؤ تھا اور اسلامیان ہند کی تہذیب سے انھیں
گہری دلچسپی تھی۔ اس زبان کو ترقی اور فروغ دینے کے لئے اور اس کے عشق میں
وہ یہ تک کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ "میری لسانی عصبیت میری دینی عصبیت سے
کسی طرح کم نہیں ہے"۔ ایسے شخص کے بارے میں اس طرح سوچنا ایک ایسا جرم
ہے جس کو ادبی تنقید کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

علامہ اقبال نہ صرف اردو زبان کے ماہر تھے بلکہ اس کے فن کار بھی تھے۔ وہ
اس کی گرامر نہ جانتے ہوں یا اس گرامر سے انھیں دلچسپی نہ ہو، لیکن اس زبان کی مزاج
دانی کا شعور ان کے ہاں موجود تھا۔ بلکہ گرامر کا نہ جاننا یا اس سے دلچسپی نہ لینا تو اس
اس بات کی دلیل ہے کہ بہ حیثیت ایک ادبی زبان کے وہ اس کے مزاج داں تھے

---

[1] اقبال نامہ، جلد اول، ص ۴۷

اور اس کو استعمال کرنے پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ زبان داں کے لئے اپنی زبان کی قواعد اور گرامر کا جاننا ضروری نہیں ہوتا تخلیق ادب کی سطح میں تو زبان کا استعمال کچھ اور ہی تقاضے کرتا ہے۔

ان تقاضوں کو علامہ اقبال نے اپنی نثر نگاری میں پورا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اسلوب نثر کو ان حالات یا ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جس کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب نثر ہر جگہ اپنے موضوع کے ساتھ مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔ جو زبان وہ استعمال کرتے ہیں، جن الفاظ کے ذریعے وہ اپنے تجربات کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں جو لہجہ اختیار کرتے ہیں اور جس مخصوص آہنگ سے کام لیتے ہیں وہ خیال، تجربے اور نظریے کی تصویروں کو سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اسی میں ان کے اسلوب نثر کی بڑائی ہے۔

زبان کے استعمال میں علامہ اقبال کے ہاں تنوع اور رنگارنگی ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے اور یہ وحدت زبان کے صحیح استعمال، الفاظ کی موسیقیت، جملوں اور فقروں کی روانی، عبارت کے بہاؤ، تصویروں کی تخلیق، تشبیہات و استعارات کی مرصع کاری اور مجموعی طور پر اسلوب نثر کو رنگینی اور پرکاری سے ہم کنار کرنے کی خواہش میں نظر آتی ہے۔ یہ آخری بات، یعنی رنگینی اور پرکاری کی خواہش اور آرزو کا احساس تو ان کی نثر میں ہر جگہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی نثر ادبیت سے ہم کنار ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس میں ایک شاعرانہ رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

موضوع کی مناسبت سے زبان کے فن کارانہ استعمال کی جو صورتیں علامہ اقبال کی نثر میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، ان کا اندازہ ان چند اقتباسات نثر ہی سے ہو سکتا ہے:

"ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" جو زبان علامہ نے استعمال کی ہے، وہ اس علمی

موضوع پر ان کے اسلوب نثر کی صحیح نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قانون انتخاب فطری کے اکتشاف عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادے کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا، حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلے سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً مادر ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقت نظر سے کی گئی اور ان فلاسفہ نے، جن کی خیال آفرینیاں ڈارون کے مقدمۂ حکمت کا تتمہ ہیں، جب حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا انکشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔"[۱]

اس اقتباس میں فلسفیانہ، عمرانی اور سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی موضوعات پر اظہار خیال ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ایک مفکرانہ سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کی گرفت زبان و بیان پر بہت سخت ہے۔ وہ مناسب علمی اصطلاحات کو صحیح معنویت کے ساتھ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح ان کا مافی الضمیر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس عالمانہ سنجیدگی اور علمی اصطلاحات کے باوجود لکھنے والے کا رجحان ادبیت اور شعریت کی طرف نظر آتا ہے۔ اسی لئے تو وہ اس قسم کے جملے لکھتے ہیں کہ "تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلے سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً مادرِ ایام کے سراپا اسرار بطن سے

---

[۱] مقالاتِ اقبال (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر)، ص ۱۱۶۔

پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے" جن کے شاعرانہ رنگ و آہنگ سے کوئی بد ذوق ہی انکار کر سکتا ہے۔

اب ایک اقتباس اور دیکھئے جو مذکورہ بالا خیال کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ قومی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیات مسیح یا آیاتِ ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لئے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں، اور اگر بحث چھڑ جائے، اور بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے، تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ پرانا علم و فضل، جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا، نام کو بھی نہیں۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہاں امرا کی عشرت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہے۔ خیر سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے پہلے سے ہیں۔ ابھی میاں تیسری بیوی کی تلاش میں ہیں اور پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں۔ کبھی گھر کی جوتی پیزار سے فرصت ہوئی تو بازار کی کسی حسن فروش نازنین سے بھی گھڑی بھر کے لئے آنکھ لڑا آئے۔ اصل تو کسی کو جرات نہیں کہ حضرت کو نصیحت کرے اور اگر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ ہو تو چیں بہ جبیں ہو کر ارشاد فرماتے ہیں: ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" [1] (قومی زندگی)

یہ ایک علمی اور سنجیدہ مضمون کا اقتباس ہے لیکن اس میں بھی انداز کا تیکھا پن موجود ہے شوخی بھی ہے، محاورے اور روزمرہ کا برمحل استعمال بھی ہے جس سے یہ

[1] مقالاتِ اقبال (قومی زندگی)، ص ۵۲

تحریر نثر کا اعلیٰ نمونہ بن جاتی ہے۔ لیکن رنگین اور پرکار شاعرانہ اسلوب اس میں بہر صورت غالب رہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی بنیادی خصوصیت ہے۔

زبان و بیان اور روز مرہ اور محاورے کا صحیح استعمال علمی موضوعات میں شاعرانہ اسلوب نثر کو کس طرح پیدا کرتا ہے، اس کی وضاحت اس اقتباس سے پوری طرح ہو جاتی ہے" ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں جماعت یا قوم کو نئے تہذیبی اور سائنسی حالات سے آشنا ہونے کے لئے جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کی تصویر علامہ اس طرح کھینچتے ہیں:

"میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں کہ زمانہ حال میں بھی کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعے نشو و نما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان و مکان کے پردے کو درمیان سے اٹھا سا دیا ہے اور دنیا کی مختلف قومیں، جن میں پہلے بعد المشرقین حائل تھا، اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی حالت بدل کر رہ جائے گی اور بعض قومیں بالکل ہی ملیامیٹ ہو جائیں گی"۔[1]

(ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر)

زبان کے صحیح استعمال، روز مرہ اور محاورے کے چٹخارے اور تشبیہات و استعارات سے بھرپور انداز بیان نے اس عبارت کو سنجیدگی، ثقاہت اور علمیت کے باوجود ایسا رنگین اور پرکار بنا دیا ہے کہ اس میں شاعری کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبال کے اسلوب نثر کا عام انداز یہی ہے اور اس حقیقت سے کوئی بھی

---

[1] مقالاتِ اقبال (قومی زندگی)، ص ۱۳۷

انکار نہیں کر سکتا کہ اقبال زبان و بیان کا استعمال بڑی مشاقی کے ساتھ کرتے ہیں۔ روزمرہ اور محاورے کا استعمال ان کے ہاں فن کاری کی صورت میں نظر آتا ہے اور علمی موضوعات کو تخیلی انداز سے آراستہ و پیراستہ کر کے اس طرح پیش کرنا کہ خیال اور تجربہ شاعری سے رنگین اور شعریت سے پرکار ہو جائے، علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

غرض یہ کہ علامہ اقبال نے ایک ایسا اسلوب نثر پیدا کیا ہے جس میں موضوع اور طریقۂ اظہار کی مکمل ہم آہنگی ہے اور جو ان کی طبیعت کی رومان پسندی اور مزاج کی رنگین کاری کی وجہ سے ایسا رنگین اور پرکار ہے کہ شاعری سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

۸

علامہ اقبال کے اس اسلوب نثر میں کئی تحریکوں اور کئی رجحانات و میلانات کا عکس ہے۔ اس میں مغرب کی فلسفیانہ اور مفکرانہ تحریروں کے اثرات بھی موجود ہیں اور مشرق کی فلسفیانہ، دینی اور مفکرانہ تحریروں کی چھاپ بھی خاصی نمایاں نظر آتی ہے۔ علامہ نے مغرب کے فلسفیوں کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور مشرقی مفکرین بھی ان کے سامنے رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ اثر انھوں نے سرسید اور ان کے رفقا، خصوصاً حالی، شبلی اور نذیر احمد کا قبول کیا ہے۔ جو چنانچہ موضوعات انھوں نے اپنی نثر کے لئے منتخب کئے ہیں ان کا تعلق بھی مغرب و مشرق کے مفکرین، اور سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کے موضوعات و مضامین سے ہے۔ معاشیات و اقتصادیات، فلسفہ و تصوف، تعلیم و تربیت، معاشرت اور تہذیب و تمدن، ثقافت و ادب اور شاعری، ان تمام موضوعات پر علامہ اقبال نے

قبل اور ان کے زمانے میں لوگ لکھتے رہے تھے۔ اقبال نے بھی اس فضا سے اثر قبول کیا اور اپنے زمانے کے ان معاملات و مسائل کی طرف توجہ کی۔ اس کا نتیجہ ان کی نثر اور اسلوب نثر کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔

اقبال اپنے عہد کی پیداوار تھے لیکن انھوں نے اپنے عہد کو پیدا بھی کیا۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی تحریکوں سے اثرات قبول کر کے، اپنے فکر و خیال اور انداز و اسلوب سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن میں ایک اجتہادی شان اور ایک نئی آن بان تھی۔ فلسفے میں انھوں نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا۔ قومی اور ملی مسائل کو سلجھانے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ کاروبارِ حیات میں انھوں نے خودی اور خود اعتمادی کے خیالات کو عام کیا اور افراد کے ہاتھوں میں عمل اور ذوقِ یقین کے پرچم دے دیئے۔ یہ کام انھوں نے بیشتر اپنی شاعری کے ذریعے انجام دیا لیکن جب ضرورت پیش آئی تو ان موضوعات کی فلسفیانہ تحلیل کے لئے انھوں نے نثر کو بھی استعمال کیا، اور یہ نثر ان کے یہاں ایک تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر کے، ایک فن بلکہ فنِ لطیف بن گئی۔

نثر اور اسلوبِ نثر کو فن اور فنِ لطیف بنانے میں علامہ اقبال کی اس شخصیت کا بڑا ہاتھ ہے جو نورِ بصیرت، آدابِ خود آگاہی، ذوقِ یقین، نالہ ہائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے مرکب تھی۔ اس کے اثرات ان کی نثر میں بھی نمایاں ہیں۔ اس میں فکر ہے، جذبہ ہے، احساس ہے، شعور ہے اور زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو حسن و جمال سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کرنے کا شعوری اور غیر شعوری احساس ہے۔ ان کے اسلوب نثر کا خمیر انھیں تمام چیزوں سے اٹھا ہے اور ان سب کے اثرات مختلف زاویوں سے ان کی نثر اور اسلوب نثر میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اس میں سنگینی کے ساتھ لطافت کی جو بنیادی خصوصیت نظر آتی ہے،

وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

عہدِ اقبال اسلامیان ہند کی نشاۃ الثانیہ کا دور ہے۔ اس کا آغاز تو شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی کی تحریکوں سے ہو چکا تھا لیکن سرسید نے اس تحریک کے ہاتھوں میں ایک پرچم دے دیا، اور اس طرح اسلامیانِ ہند کے اس قافلے نے آگے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سیف و قلم کے ایک سے ایک جانباز اس میں شریک رہے۔ انیسویں صدی میں سرسید کے ساتھ حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقارالملک اور چراغ علی وغیرہ سب اس نشاۃ الثانیہ کے علم بردار تھے اور ان کی تحریریں اسی نشاۃ الثانیہ کی ترجمان اور عکاس ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے سپاہی تھے اس لئے ان کے قلم نے تلوار کا کام بھی کیا۔

علامہ اقبال نے آنکھ کھولی تو فضا میں نشاۃ الثانیہ کی اس تحریک کے پرچم لہراتے ہوئے دیکھے اور ملت اسلامیہ کے سپاہیوں کے قلم میں انھیں تلوار کی کاٹ نظر آئی۔ ان کا دل ملت اسلامیہ کے درد سے معمور تھا اس لئے انھوں نے بھی اپنے قلم میں تلوار کے جوہر پیدا کئے اور مختلف موضوعات پر جاندار نثر لکھی۔ اس نثر میں بڑی زندگی ہے، بڑا زور ہے اور بڑی ہی جولانی ہے۔ اس میں خاصی بلند آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی رواں دواں قسم کی نثر ہے۔ اس میں بلا کی روانی ہے غضب کا بہاؤ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں پہاڑی ندی کا سا شور نہیں ہے بلکہ میدانوں میں بہتی ہوئی ندی کا زیر و بم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہنگامے کی پیداوار نہیں ہے۔ اسی لئے تو اس میں روانی، بہاؤ اور کاٹ کے باوجود اس شائستگی اور تہذیب کا احساس ہوتا ہے جس کا منبع احساسِ توازن ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس بات سے اختلاف ہو لیکن ہے یہ حقیقت کہ توازن کی یہ دولت اقبال کو اس صورتِ حال نے عطا کی ہے جو حقیقت پسندی اور رومانیت کے گلے ملنے کے نتیجے میں بیسویں صدی کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی اقبال نے اس عہد کی آواز کے ساتھ اپنی آواز کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

اس آواز میں رس ہے، رعنائی ہے، موسیقیت ہے اور ایک نغمائی کیفیت ہے۔ یہ فضا میں گونجتی ہے تو نغمے سے پھوٹتے ہیں اور رنگ سے بکھرتے ہیں اور پھر ان نغموں اور رنگوں سے ساری فضا مترنم، رنگین اور پرکار سی ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال کا اسلوبِ نثر اسی کیفیت کا علم بردار اور اسی صورتحال کا آئینہ دار ہے۔

چھٹا باب

اردو نثر میں علامہ اقبال کا مرتبہ

ا علامہ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر اور ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اردو شاعری کو فکر و فلسفہ کے فن کارانہ اظہار و ابلاغ سے آشنا کیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ترجمان حقیقت ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ شاعری کو انھوں نے اپنی فکر سے بلند کیا ہے اور فلسفے سے عظیم بنایا ہے عظمتِ انسانی ان کا خاص موضوع ہے۔ طاقت کو وہ انسانی عظمت کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ قوم اور ملّت کو بلندیوں سے ہم کنار کرنا ان کا نصب العین ہے۔ افراد میں خودی کو بیدار کرنا ان کا خاص موضوع ہے کیونکہ اسی سے انسان کامل اور مرد مومن بنتا ہے۔ ان تمام موضوعات کی تفصیل و جزئیات ان کی شاعری کا موضوع ہے، اور ان کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے شاعری میں بھی ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے جو ان کی فن کارانہ عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

نثر انھوں نے کم لکھی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ شاعری نے انھیں اتنا

وقت نہیں دیا کہ وہ نثر کی طرف باقاعدگی سے توجہ کرتے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے خیالات و نظریات کے اظہار کے لئے نثر کو استعمال کیا اور کچھ مضامین لکھے بسوائے "علم الاقتصاد" کے ان کی کوئی مستقل تصنیف نثر میں نہیں ہے۔ صرف چند مضامین ہیں جو انھوں نے "مخزن"، "اخبار وطن"، یا "وکیل" میں لکھے یا پھر بعض مقدمے اور دیباچے ہیں جو انھوں نے اپنی شعری تصانیف پر تحریر کئے۔ البتہ ان کے خطوط کا خاصا بڑا ذخیرہ نثر میں موجود ہے جس کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بس ان کی نثر کی کل کائنات یہی ہے جس سے اردو نثر میں ان کے مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

ہر چند کہ "علم الاقتصاد" انھوں نے اپنے قومی و ملی فرائض کو پورا کرنے کی غرض سے لکھی لیکن اس کتاب سے اردو نثر ایک نئے علمی موضوع سے آشنا ہوئی۔ اس سے قبل اردو میں کسی نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا تھا اقبال کو اس اعتبار سے اولیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے ایسے اہم موضوع پر کئی سو صفحات کی ایک مستقل تصنیف پیش کی۔ اس کو پیش کرنے میں صرف اخذ و ترجمہ تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ جو مواد ان کی دسترس میں تھا، ان کو سامنے رکھ کر اس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ایک باقاعدہ کتاب کی صورت میں خود بھی روشنی ڈالی اور زبان و بیان کا ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس سے نہ صرف اس موضوع سے متعلق مختلف مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا بلکہ اس علمی اسلوب سے پڑھنے والے کو ایک طرح کی لذت بھی حاصل ہوئی۔

علامہ اقبال نے اس اعتبار سے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور اس طرح وہ اردو نثر کی روایت میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

اقتصادیات کے علاوہ دوسرے علمی موضوعات پر بھی انھوں نے نثر لکھی ہے جو اگرچہ مقدار میں ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن موضوع اور اندازِ بیان دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ان کی اس نثر کی بنیاد اخلاص اور غور و فکر پر

استوار ہے۔ اس اعتبار سے ان کے مضامین" بچوں کی تعلیم و تربیت" میں انھوں نے بچوں کی نفسیات، تعلیم کے بنیادی اصول، اس وقت کی تعلیمی صورت حال اور قومی ملی تعلیم کے معاملات و مسائل پر خیال انگیز نثر لکھی ہے، اور جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے، انھوں نے اسلوبِ نثر کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی باتیں نہایت فکر انگیز ہیں۔ ان کا اظہار و ابلاغ پوری طرح ہوا ہے اور کہیں بھی الجھاؤ اور ابہام کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی اور ایک سادہ، رواں اور شگفتہ انداز بیان ان کی اس نثر کو مؤثر بناتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے موضوعات پر نثر لکھنے کی ایک عظیم روایت سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اردو میں قائم کر دی تھی اور قومی، ملی، دینی، تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی اور ادبی موضوعات پر سادہ نثر لکھنے کا ایک اعلیٰ معیار قائم کر دیا تھا۔ اقبال نے اس معیار کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے لیکن اس میں اضافے بھی کئے ہیں اور اس طرح اس معیار کو کچھ اور بھی بلندی سے ہم کنار کیا ہے۔ ایک تو ان کے فکر کی گہرائی نے ان کی اس نثر میں زیادہ پختگی اور گہرائی پیدا کی ہے، دوسرے ان کا انداز بیان زیادہ رواں شگفتہ اور شاداب ہے جو دل و دماغ اور حواس پر اثر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

علمی نثر کے لحاظ سے ان کے ابتدائی زمانے کے مضامین اور اسلوب نثر دونوں اعتبار سے یقیناً اہمیت رکھتے ہیں لیکن آگے چل کر انھوں نے جو دیباچے، مقدمے اور مقالات لکھے ہیں وہ علمی نثر کے ایسے نمونے ہیں جن کا مقابلہ مغرب کے بڑے بڑے لکھنے والوں کی علمی نثر سے کیا جا سکتا ہے۔ ان میں "اسرار خودی" اور "پیام مشرق" کے دیباچوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر"، کو تو ان کی عظیم نثر کا شاہکار سمجھنا چاہیئے۔ اقبال کی ان تحریروں میں جو

عالمانہ سنجیدگی اور جو فکری گہرائی پائی جاتی ہے، وہ اُردو نثر کے لئے ایک نئی چیز ہے علامہ نے اس میں فلسفیانہ اور علمی پہلوؤں پر سادہ، رواں اور شگفتہ نثر لکھنے کا نیا تجربہ کیا ہے۔ اقبال سے پہلے اس قسم کی نثر کے نمونے اُردو میں نہیں ملتے۔ البتہ ان کے زمانے میں بعض لکھنے والوں نے اس قسم کے موضوعات پر نثر لکھی ہے جو اپنی جگہ اُردو نثر میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی نثر خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا اعتراف خود اقبال نے بھی کیا ہے لیکن اقبال کی نثر اقبال کی نثر ہے اور اسی لئے وہ اپنی جگہ منفرد نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال نے علمی نثر میں اظہار و ابلاغ کا جو معیار قائم کیا ہے، اس نے ان کے اسلوب نثر میں وہ خصوصیت پیدا کردی ہے جس کے اسلوب پر بعض لکھنے والوں نے صفائی یا PRECISION سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے خیالات اس نثر میں بہت واضح نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اور کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا۔ وہ ذہن کو روشن کرتی ہے، فکر میں حرکت پیدا کرتی ہے اور اعصاب کو متاثر کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ نثر کے بارے میں یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ صحیح فکر کی زبان ہے، اور اس کو اسی کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ بات علامہ اقبال کی اس علمی نثر پر صادق آتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ان کے ذہنی اور فکری مشاغل کا عکس ہے اور انھوں نے جو اسلوب اس میں اختیار کیا ہے اس کو بہ یک وقت ایک ذہنی اور جذباتی تجربے کے امتزاج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس علمی نثر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے کئی سو صفحات خطوط کی شکل میں بھی لکھے ہیں۔ ان میں بعض خطوط تو ایسے ہیں جو انھوں نے سفرناموں کی صورت میں لکھے ہیں، اور ان میں اپنی روداد سفر بڑے ہی لطیف اور دلکش انداز میں بیان

کی ہے۔ ان کے دو خط جن میں لندن کے سفر کی تفصیل ہے، ہلکی پھلکی نثر کا بہت ہی اچھا نمونہ ہیں۔ ان میں اقبال نے اپنی دلچسپ زندگی کے حسین اور لطیف پہلوؤں سے ظاہر کی ہے۔ چنانچہ ان میں کہیں مناظر فطرت کی تصویر کشی ہے، کہیں بعض شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے، کہیں بعض لوگوں کی حرکات و سکنات کی تفصیل ہے اور کہیں انسانی رشتوں کی فن کارانہ مصوری ہے۔ غرض ان کو علامہ اقبال نے سیدھے سادے الفاظ میں اس طرح پیش کیا ہے، اور ساتھ ہی ایسے ایسے رنگ بکھیرے ہیں کہ ان کا اسلوب نثر دلوں میں اترتا ہے اور حواس میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے اسلوب نثر کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں اعتدال اور توازن کی خصوصیت پڑھنے والے پر سکون کا اثر چھوڑتی ہے۔ چونکہ اس میں پرشور کیفیت نہیں ہے اس لئے اس سے ہیجان پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ پڑھنے والے میں ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی طور پر تہذیب پیدا کرتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اقبال نے اپنے عہد کے افادی رجحان کے ساتھ رومانی تحریک کے اثرات کو آپس میں اس طرح شیر و شکر کیا ہے کہ ان کا اسلوب ان دونوں کا ایک سنگم سا بن گیا ہے اور اس میں مجموعی طور پر بڑی ہی متوازن کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہی توازن اس کا حسن ہے جو دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اپنے عہد کے ان دونوں رجحانات کو یکجا کر کے علامہ اقبال نے اُردو میں اسلوب نثر کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہوتا کیونکہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لکھنے والے اپنے زمانے کی زندگی کے دھارے کے ساتھ بہتے ہیں، اور وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں جو ان کے عہد پر غالب ہوتا ہے۔ لیکن علامہ اقبال زمانے کے دھارے کے ساتھ بہہ جانے والے نہیں تھے، کیونکہ ان کے پاس زندگی، تاریخ، تہذیب، حاضر

اور حسن و جمال کا شعور تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لے کر صحیح راستہ بنانے اور اس پر گامزن ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کے فن دونوں میں ایک اجتہادی شان نظر آتی ہے۔

یہی اجتہادی شان ان کے اسلوب نثر میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے زمانے میں رومانیت کی تحریک وجود میں آئی اور دیکھتے دیکھتے اپنے شباب پر پہونچ گئی۔ سنجیدہ نثر میں اس تحریک کے اثرات سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں ملتے ہیں۔ ان کی آواز اس زمانے کی ادبی فضا میں اس طرح گونجتی ہوئی نظر آتی ہے کہ دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ تخیل کی ساحری اور اس کے اثر سے الفاظ کی مرصع کاری کا کمال اگر دیکھنا مقصود ہو تو وہ ابوالکلام کے نثر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ رنگینی اور رعنائی وہ بلندی اور بلند آہنگی اور وہ جگمگاہٹ اور تابانی، جو ہمیں ابوالکلام کے نثر میں ملتی ہے، وہ اردو نثر لکھنے والوں میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی تیس چالیس برسوں میں ابوالکلام آزاد اردو نثر پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کی صحافتی اور ادبی نثر پر ان کے اسلوبِ نثر کی گہری چھاپ ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ شاید ہی کوئی اس اسلوبِ نثر کے اثر سے بچا ہو۔

علامہ اقبال نے اس رومانیت اور رومانی انداز کو اپنے حدود میں رکھا اور فکر و شعور سے کام لے کر اس میں اعتدال پیدا کیا۔ پھر ایک ایسے اسلوبِ نثر کی داغ بیل ڈالی جس میں رومانیت کا ہیجان سکون سے ہمکنار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ رومانیت سے رنگینی تو اقبال نے حاصل کی ہے لیکن اس کی پر شور کیفیت کو سکون میں بھی تبدیل کر دیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو اردو نثر کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ان کے اس تجربے نے اپنے عہد کی نثر نگاری کے مذاق میں (TASTE OF THE AGE) تبدیلی پیدا کی، اور اس طرح اسکے مزاج کو

بدل دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ اقبال کے ہاں اسلوب نثر نے فکر و شعور کے اظہار میں رنگینی کی صورت اختیار کر لی اور اس صورت حال نے اقبال کی نثر میں ایک تخلیقی رنگ و آہنگ پیدا کر دیا۔ میتھیو آرنلڈ نے اس قسم کے تخلیقی اسلوب کو غیر معمولی قدر و قیمت کا حامل بتایا ہے، اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اسلوب کی ساحری اس تخلیقی عمل کا دوسرا نام ہے۔ جو شخص اس تخلیقی عمل کی صلاحیت رکھتا ہے وہ نہ صرف خود تخلیق کرتا ہے بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی کسی نہ کسی حیثیت سے تخلیقی عمل کی طرف راغب کرتا ہے، اور اس تخلیقی عمل سے لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کو بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنے اسلوب نثر سے یہی کام لیا ہے اور اس اعتبار سے، بہ حیثیت ایک نثر نگار ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

والٹ وہٹمن (WALT WHITMAN) نے ایک جگہ شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "میں بہت بڑا ہوں، بے حد وسیع و عریض ہوں۔ میرے اندر ایک ہجوم ہے، ایک جم غفیر ہے" (I AM LARGE, I CONTAIN MULTITUDES) علامہ اقبال کی نثر کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے اور وہ اسی کیفیت سے پہچانی جاتی ہے۔ موضوعات کی تنوع اور اظہار کے جمالیاتی آہنگ نے ان کی نثر کو وسعت اور ہمہ گیری سے ہمکنار کیا ہے اور وہ ہر زاویے سے ان کی پہلو دار اور ہمہ گیر شخصیت کا عکس نظر آتی ہے۔ اختصار کے باوجود اس میں جامعیت ہے، تنوع ہے، وسعت ہے، ہمہ گیری ہے، گہرائی ہے، پختگی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس شاعر اعظم کی خداداد فنکارانہ صلاحیتوں نے اس میں بے شمار ایسے رنگ بکھیر دیئے ہیں، جن کے حسین و دلآویز امتزاج نے اس کو ایک دل موہ لینے والی قوس قزح کا روپ دے دیا ہے۔

کتابیات

اس کتاب کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

(۱)

J. Middleton Murry : The Problem of Style, Oxford University Press, 1952.

F. L. Lucas : Style, Pan Books London 1955.

Hazlitt : On Familiar Style (Master Works and English Proses, New York 1967).

W. K. Wismatt : Prose Style of Johnson, London 1941.

Holbrook Jackson : The Reading of Books.

Herbert Read : English Prose Style, London 1928 (Second Edition).

A. C. Clark : Prose Rhythm in English, London 1913.

Rene Wellek & A. Warren Theory of Literature, 1949.

M. W. Croll : Cadence of English Prose, N. Carolina 1919.

Saintsbury : English Prose Rhythm, London 1952.

John Bradley & Martin Stevens : Master Works of English Prose —Holt, Rinbart & Winston. New York 1967.

K. G. Saiyidain : Educational Philosophy of Iqbal. Sh. Mohd. Ashraf, Lahore 1941.

S. A. Vahid : Iqbal's Art and Thought, Sh. Ashraf, Lahore.

Saeed Shaikh : Studies in Iqbal Thought and Art, Bazm-e-Iqbal, Lahore, 1972.

(۲)

علامہ اقبال : بانگ درا، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور، طبع بست و ششم، مئی ۱۹۶۹ء

: بال جبریل، ایضاً، طبع ہفدہم، جولائی ۱۹۷۰ء

: ضرب کلیم، ایضاً، طبع یازدہم، اپریل ۱۹۶۳ء

: پیام مشرق، شیخ مبارک علی لاہور، طبع دہم، ۱۹۶۳ء

: ارمغان حجاز، ایضاً، طبع ہفتم، جون ۱۹۵۹ء

: اسرار و رموز، ایضاً، بار ششم، ۱۹۶۴ء

(۳)

علامہ اقبال : علم الاقتصاد، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۶۱ء

: اقبال نامہ (حصہ اول و دوم) مرتبہ شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۴۱ء

: مقامات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۶۳ء

: مکتوبات اقبال بہ نام سید نذیر نیازی، مرتبہ سید نذیر نیازی، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۷ء

: مکاتیب اقبال بنام گرامی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء

: مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں، بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۴ء

: انوار اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء

: باقیات اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۶ء

: خطوط اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء

: گفتارِ اقبال، مرتبہ محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور، ۱۹۶۶ء

(۴)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی : سیرتِ اقبال، قومی کتب خانہ لاہور، ستمبر ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر یوسف حسین خاں : روحِ اقبال، آئینۂ ادب لاہور، ۱۹۶۳ء

پروفیسر عزیز احمد : اقبال نئی تشکیل، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۶۸ء

پروفیسر سید وقار عظیم اقبال شاعر اور فلسفی، تصنیفات لاہور، ۱۹۶۸ء

: اردو، اقبال نمبر، ۱۹۴۰ء

مولانا صلاح الدین احمد : تصوراتِ اقبال، ادارہ ادبی دنیا لاہور، ۱۹۶۷ء

گوہر نوشاہی : مطالعۂ اقبال (مقالاتِ مجلۂ اقبال)، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء

سرسید : مضامینِ تہذیب الاخلاق، کتاب ایجنسی حیدرآباد، ۱۹۵۴ء

حالی : مقالات، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۵۷ء

شبلی : مقالات، معارف اعظم گڈھ، ۱۹۵۶ء

سر عبدالقادر : انتخاب مخزن، جدید اردو ادب

ابوالکلام آزاد : مضامین، دارالاشاعت کراچی، جنوری ۱۹۵۸ء

ڈاکٹر مولوی عبدالحق : خطباتِ عبدالحق، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۴ء

: مقدماتِ عبدالحق، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۴ء

سید سلیمان ندوی : نقوشِ سلیمانی، مکتبۂ شرق کراچی، ۱۹۵۱ء

: عرب اور ہند کے تعلقات، ہندوستانی اکادمی الہ آباد، ۱۹۳۰ء

(۵)

مولانا عبدالماجد دریابادی : مبادیٔ فلسفہ، معارف اعظم گڈھ، ۱۹۳۱ء

: مقالاتِ ماجد، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور

: انشائے ماجد، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء

مہدی افادی : افاداتِ مہدی، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۹ء

(۶)

حامد حسن قادری : داستان تاریخ اردو، لکشمی نراین اگروال آگرہ، ۱۹۵۷ء

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور : اردو کے اسالیب بیان، مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۲ء
سید محمد : ارباب نثر اردو، مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔
پروفیسر مجنوں گورکھپوری : ادب اور زندگی، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۶۹ء
: نقوش و افکار، صفیہ اکیڈمی کراچی، اپریل ۱۹۶۶ء
پروفیسر آل احمد سرور : تنقیدی اشارے، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
: نئے اور پرانے چراغ، اردو اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۷ء
: ادب اور نظریہ، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۴ء
پروفیسر سید احتشام حسین : تنقید اور عملی تنقید، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء
ڈاکٹر سید عبد اللہ : میر امن سے عبد الحق تک، مجلس ترقی ادب لاہور، مئی ۱۹۶۵ء

(۷)

رسائل

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ
مخزن، لاہور
اردو، اقبال نمبر
نیرنگ خیال، اقبال نمبر
صحیفہ، اقبال نمبر

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مکتبہ الفاظ
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱